مطالعاتی رہنما

برائے بی ایس پروگرام

پنجابی تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب

کورس کوڈ: 6597 یونٹ: 1 تا 9









شعبہ پاکستانی زبانیں

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مطالعاتی رہنما

برائے بی ایس پروگرام

پنجابی تہذیب، ثقافت اور زبان وادب

کورس کوڈ:6597 یونٹ 1 تا 9



شعبہ پاکستانی زبانیں

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

ایڈیشن: : اول

اشاعت اول : 2024ء

تعداد اشاعت :

قیمت :

ٹائٹل :

کمپوزر : امتنان اقبال (شعبہ پاکستانی زبانیں)

پرنٹرز :

کورس ٹیم

چیئرمین:	پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
ادارہ تحریر:	ڈاکٹر زیب النساء
	ڈاکٹر عائشہ رحمٰن
نظر ثانی:	ڈاکٹر زیب النساء
	ڈاکٹر عائشہ رحمٰن
	زبیدہ اقبال
	خرم شہزاد
فاصلاتی تشکیل:	پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
	ڈاکٹر عبدالواجد تبسم
	ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن بلوچ
	ڈاکٹر حاکم علی برڑو
	ڈاکٹر زیب النساء
کورس رابطہ کار:	**ڈاکٹر زیب النساء**

فہرست

پیش لفظ:	پروفیسر ڈاکٹر ناصر محمود (وائس چانسلر)	05
دیباچہ:	پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد (چیئرمین)	07
کورس کا تعارف	ڈاکٹر زیب النساء (کورس رابطہ کار)	09
یونٹ نمبر:1	پنجاب اور پنجابی زبان	10
یونٹ نمبر:2	پنجابی تہذیب و ثقافت	24
یونٹ نمبر:3	پنجابی لوک ادب	45
یونٹ نمبر:4	لوک قصے اور داستانیں	65
یونٹ نمبر:5	دینی ادب	78
یونٹ نمبر:6	پنجابی کے صوفی شاعر	116
یونٹ نمبر:7	جدید پنجابی شاعری	136
یونٹ نمبر:8	پنجابی افسانوی ادب	151
یونٹ نمبر:9	پنجاب کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز	170

پیش لفظ

پاکستان متنوع ثقافتوں اور زبانوں کا ایک منفرد گہوارہ ہے، جہاں ہر خطے کی زبان، ادب اور تہذیب اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ یہی لسانی اور تہذیبی تنوع ہماری قومی یکجہتی کی بنیاد ہے، جو ہمیں دنیا میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک قوم کی فکری، ادبی اور تہذیبی شناخت کا مظہر بھی ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے ماضی کو محفوظ کرتی ہے، بلکہ ہمارے مستقبل کی تعمیر میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی جو ہمیشہ علم کی روشنی کے پھیلانے میں پیش پیش رہی ہے، نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بی ایس سطح پر پاکستانی زبانوں کے چار نئے کورسز متعارف کروائے ہیں۔ یہ کورسز پشتو، پنجابی، بلوچی اور سندھی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کا جامع مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کورسز کا مقصد نہ صرف طلبہ کو پاکستانی زبانوں اور ان کے ادبیات سے روشناس کرانا ہے، بلکہ انھیں پاکستان کی تہذیبی گہرائیوں اور متنوع ثقافتی ورثے کی اہمیت کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرنا ہے۔

بی ایس کے ان تدریسی کورسز میں پاکستان کی لوک کہانیوں، صوفیانہ شاعری، دینی ادب اور جدید افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے تاریخی آثار، تہذیبی مراکز اور ان زبانوں کی جغرافیائی اور تاریخی ارتقا کے بارے میں تدریسی یونٹ شامل ہیں۔ ان کورسز کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ نسلِ نو کو ان کے عظیم ثقافتی اور ادبی ورثے سے قریب لانے کا ذریعہ بنیں گے۔

یہ کورسز قومی یکجہتی اور ملی ہم آہنگی کو فروغ دینے کا ایک مضبوط وسیلہ بنیں گے، کیونکہ طلبہ اپنی مادری زبان کے بجائے دیگر زبانوں کے کورسز کا انتخاب کریں گے، جو انھیں وطنِ عزیز کی مختلف ثقافتوں کو سمجھنے اور ان کا احترام کرنے کی تربیت دیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کورسز کے ذریعے طلبہ پاکستانی زبانوں، ان کے ادبیات اور تہذیب و ثقافت کی گہرائیوں میں اتر کر ان کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور اپنے قومی ورثے کی اصل بنیادوں کی تہ تک پہنچیں گے۔ یہ قدم نہ صرف تعلیمی میدان میں ایک انقلابی پیش رفت ہے، بلکہ یہ ہمارے سماجی و ثقافتی شعور کو بھی تقویت بخشے گا۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہمیشہ علم و ادب کی تدریس، تحقیق اور وطنِ عزیز کی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے کوشاں رہی ہے۔ یہ اس مشن کو مزید وسعت دینے کی طرف ایک اور قدم ہے۔ شعبہ پاکستانی زبانیں کی یہ قابلِ ستائش کاوش اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نہ صرف تعلیمی ترقی کے لیے کوشاں ہے، بلکہ پاکستان کے لسانی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت اور فروغ میں بھی اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر رہی ہے۔ میں ان کورسز کی پیشکش پر شعبے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ یہ کورسز ہماری نئی نسل کی فکری، سماجی اور ثقافتی تربیت میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر ناصر محمود

وائس چانسلر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

دیباچہ

پاکستان کی سرزمین اپنی منفرد ثقافتی، لسانی اور تہذیبی رنگارنگی کے باعث دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہاں بولی جانے والی زبانیں، رچائی ہوئی ثقافتیں اور قدیم تہذیبوں کے مظاہر اس خطے کے عظیم تاریخی ورثے کی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستانی زبانیں نہ صرف لسانی تنوع کی علامت ہیں بلکہ یہ مختلف خطوں کی تہذیبی، ادبی اور فکری روایتوں کی امین بھی ہیں۔ یہ ہماری قومی شناخت کو مضبوط کرتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر سرزمینِ پاک کو ایک منفرد پہچان فراہم کرتی ہیں۔

شعبۂ پاکستانی زبانیں، اس عظیم ثقافتی ورثے کی حفاظت اور اس کی ترویج کے لیے کوشاں ہے۔ یہ شعبہ نہ صرف پاکستانی زبانوں کی تدریس کا ایک اہم مرکز ہے، بلکہ ان زبانوں کے ادب، ثقافت اور لسانی سرمائے پر تحقیق کے لیے ایک مضبوط علمی بنیاد بھی فراہم کر رہا ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے 2004ء میں شعبے نے ایم فل پاکستانی زبانیں و ادب پروگرام کا آغاز کیا، جس نے پاکستانی زبانوں کے ادبی، لسانی اور تحقیقی مطالعات کے میدان میں نئے امکانات پیدا کیے۔ 2008ء میں، اس سفر کو مزید وسعت دیتے ہوئے شعبے نے پی ایچ ڈی پروگرام کا اجرا کیا، جو وطن عزیز میں پاکستانی زبانوں کے ڈسپلن میں اولین پروگرام ہے۔

جناب وائس چانسلر کی دوراندیش قیادت اور وژن کی روشنی میں، شعبہ پاکستانی زبانیں اب ایک نئے سنگ میل کی طرف بڑھ رہا ہے اور عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر پاکستانی زبانوں اور ان کے ادبیات کے ساتھ ساتھ وطن عزیز کے مختلف خطوں کی تہذیب و ثقافت کے مطالعات پر مبنی نئے چار کورسز کا آغاز کر رہا ہے، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

- پشتون: تہذیب، ثقافت اور زبان وادب (سطح بی ایس)
- بلوچ: تہذیب، ثقافت اور زبان وادب (سطح بی ایس)
- سندھی تہذیب، ثقافت اور زبان وادب (سطح بی ایس)
- پنجابی تہذیب، ثقافت اور زبان وادب (سطح بی ایس)

ان کورسز کی پیشکش اور انتخاب کا طریقِ کار کچھ اس طرح سے ہے کہ:

- یہ کورسز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تمام بی ایس پروگراموں کے اسکیم آف اسٹڈیز کا حصہ ہوں گے۔

- بی ایس کے طلبہ ان کورسز میں سے کسی ایک کورس کا انتخاب کریں گے۔
- طلبہ اپنی مادری زبان کا کورس لینے کے اہل نہیں ہوں گے، بلکہ انھیں دیگر تین زبانوں میں سے کسی ایک کورس کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

یہ کورسز درج ذیل مقاصد کے تحت پیش کیے جارہے ہیں:

- پاکستانی زبانوں کے ادبیات اور پاکستانی تہذیب و ثقافت کی تدریس سے قومی یکجہتی کو فروغ دینا۔
- گلوبلائزیشن کے نتیجے میں پاکستانی زبانوں، ان کے ادبیات اور تہذیب و ثقافت سے نسلِ نو کی دوری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کو کم کی سمعی کرنا اور طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے ادبیات اور تہذیب و ثقافت سے روشناس کروانا۔
- طلبہ کو پاکستان کی اکائیوں کی تاریخ، حدود اربعہ، لسانی جغرافیے اور پاکستانی زبانوں کے آغاز و ارتقا سے روشناس کروانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے لوک ادب سے آگاہی دلانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے صوفیانہ ادب سے متعارف کروانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے جدید شعری ادب سے آگاہی دلانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے دینی ادب (حمد، نعت، سیرتِ رسولؐ، تفاسیر، احادیث کے تراجم) سے روشناس کرانا۔
- طلبہ کو پاکستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز سے روشناس کرانا۔

بحیثیت مجموعی طلبہ کو پاکستانی زبانوں، ادبیات اور تہذیب و ثقافت کے مطالعے کے لیے ٹھوس بنیادیں مہیا کرنا، ان چار کورسوں کا بنیادی مقصد ہے۔

پاکستانی زبانوں کے یہ کورسز نہ صرف قومی یکجہتی اور ملی ہم آہنگی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کریں گے، بلکہ ان کے ذریعے نسلِ نو، جو اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے دور ہوتی جارہی ہے، اپنے عظیم تہذیبی ورثے سے آگاہ ہوگی اور اس کی اہمیت بھی جان سکے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

صدرِ شعبہ

کورس کا تعارف

پنجاب تاریخ اور ثقافت کے اعتبار سے ایک متنوع خطہ ہے اور یہاں کا لوک، کلاسیکی و جدید ادب اس خطے کی روح اور عوام کے مزاج، نفسیات اور حالات و واقعات کا امین ہے۔ یہ کورس "پنجابی تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب" بی ایس سطح کا کورس ہے۔ اس کورس کے ذریعے طلبہ و طالبات پنجاب کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور ادب سے روشناس ہو سکیں گے۔ یہ کورس 9 یونٹوں پر مشتمل ہے۔ اس کورس کو ترتیب دیتے وقت یہ خیال رکھا گیا ہے کہ اس کورس کے ذریعے طلبہ و طالبات پنجاب اور پنجابی قوم کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور ادبی رجحانات کے مختلف پہلوؤں کو جان سکیں۔

اس کورس کا پہلا یونٹ پنجاب کی تاریخ، حدود اربعہ، لسانی جغرافیہ، پنجابی زبان کے آغاز و ارتقا، پنجابی زبان کے رسم الخط، حروف تہجی اور پنجابی زبان کے ڈائیلکٹس (لہجے) پر مشتمل ہے۔

دوسرا یونٹ پنجابی تہذیب و ثقافت پر مشتمل ہے۔ اس یونٹ میں پنجاب کی تہذیب و ثقافت کے پس منظر، پنجابی تہذیب و ثقافت کے اہم خدوخال، رسم و رواج، عُرس و میلے، روایتی کھیل اور لوک رقص کے مطالعے کے بارے میں معلومات دی گئیں ہیں۔

تیسرا یونٹ پنجابی لوک ادب پر محیط ہے۔ اس یونٹ میں پنجابی لوک شاعری کی اصناف اور لوک نثر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا یونٹ پنجابی رومانوی قصے میں مشہور پنجابی لوک اور رومانوی داستانوں جن میں ہیر رانجھا، مرزا صاحباں، سوہنی مہینوال اور پورن بھگت شامل ہیں، کی داستان اور اُس میں پنہاں اسباق کے حوالے سے معلومات دی گئی ہیں۔

پانچواں یونٹ دینی ادب ہے جس میں پنجاب میں دینی ادب کا پس منظر، پنجابی میں حمد و نعت کی روایت، قرآن حکیم اور احادیث شریف کے پنجابی تراجم اور سیرت نگاری کی روایت بیان کی گئی ہے۔

چھٹے یونٹ میں پنجابی کے صوفی شعرا میں تصوف اور اُس کی مختصر روایت بیان کی گئی ہے اور چھے عظیم پنجابی صوفی شعرا جن میں بابا فرید، شاہ حسین، سلطان باہو، بلھے شاہ، وارث شاہ اور میاں محمد بخش شامل ہیں کے صوفیانہ کلام اور اُن کے افکار بیان کیے گئے ہیں۔

ساتواں یونٹ جدید پنجابی شاعری پر محیط ہے۔ اس یونٹ میں 8 جدید پنجابی شعرا کے کلام اور ان کی ادبی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔

آٹھواں یونٹ پنجابی افسانوی ادب ہے جس میں پنجابی افسانے، ناول اور ڈرامے کے آغاز و ارتقا کو موضوع بنایا گیا ہے۔

نواں یونٹ پنجاب کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز پر مشتمل ہے۔ اس یونٹ میں ٹیکسلا، ہڑپہ، ہرن مینار، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، کھیوڑہ اور قلعہ دراوڑ کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔

عزیز طلبہ و طالبات! ہر یونٹ کے آغاز میں اُس کا تعارف اور مقاصد بھی دیئے گئے ہیں تاکہ طلبہ کو متعلقہ یونٹ کے حدود و قیود سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی روشنی میں اس یونٹ کا مطالعہ کر سکیں۔ یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ اس کورس کے مطالعے کے بعد طلبہ پنجاب کی تاریخ اور پنجابی زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کے بارے میں جان سکیں گے اور پنجاب کے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے روشناس ہو سکیں گے۔

(ڈاکٹر زیب النساء)

کورس رابطہ کار

یونٹ نمبر:1

پنجاب اور پنجابی زبان

تحریر:ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی:ڈاکٹر عائشہ رحمٰن

فہرست

یونٹ کا تعارف		12
مقاصد		12
1.1	تاریخ	13
1.2	حدود اربعہ	15
1.3	لسانی جغرافیہ	17
1.4	پنجابی زبان کا آغاز وارر تقا	17
1.5	رسم الخط اور حروف تہجی	19
1.6	ڈائیلکٹس	20
	خود آزمائی	23

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

یہ یونٹ پنجاب اور اس میں بولی جانے والی پنجابی زبان کے بارے میں ہے۔ صوبہ پنجاب پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے اور پنجابی پاکستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی مادری زبان ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد سات کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اس یونٹ میں پنجاب کی تاریخ، حدود اربعہ اور لسانی جغرافیہ کے بارے میں ضروری معلومات اور مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ پنجابی زبان کے آغاز و ارتقا اور پنجابی زبان کی بولیوں (ڈائیلیکٹس) رسم الخط اور حروف تہجی کے بارے میں بھی پڑھیں گے۔ آپ اس یونٹ کا بھرپور مطالعہ کیجیے اور آخر میں درج مجوزہ کتب سے بھی استفادہ کیجیے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. پنجاب کی تاریخ کو جان سکیں۔
2. پنجاب کے حدود اربعہ کی وضاحت کر سکیں۔
3. پنجاب کے لسانی جغرافیہ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔
4. پنجابی زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں جان سکیں اور اس کے مختلف نظریات کا محاکمہ کر سکیں۔
5. پنجابی زبان کے مختلف لہجوں، حروف تہجی اور رسم الخط کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔

پنجاب اور پنجابی زبان

1.1 تاریخ:

آج جس خطہ کو پنجاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ماضی میں یہ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا لیکن یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ لفظ "پنجاب" برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد معروف ہوا۔ اس سے پہلے اس خطے کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے کہ "رگ وید" میں "سپت سندھو" کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ پنجاب کا ہی قدیم نام تھا۔ "سپت سندھو" سنسکرت زبان کے دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ سپت مطلب سات اور سندھو مطلب دریا۔ یہ نام سات دریاؤں یا سات دریاؤں کی سرزمین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر جوالا پرشاد سنگھ سات دریاؤں کا منابع و محل وقوع بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "خیال ہے کہ ان سات دریاؤں یعنی "سپت سندھو" کا منبع پنجاب کے شمالی علاقے یا پھر کشمیر ہی میں ہو سکتا تھا"

"رگ وید" میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ کوئی پانچ لاکھ قبل مسیح میں کوہ ہمالیہ کا سلسلہ اور کشمیر جھیل کی بلندی میں اضافہ ہوا جب کہ اسی وقت سلسلہ کوہ پنجال کے چند حصوں کی اونچائی میں کمی واقع ہوئی۔ اس کے نتیجے میں کشمیر جھیل کا پانی سات دریاؤں کی شکل میں بہنے لگا اور اسی وجہ سے یہ سرزمین "سپت سندھو" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ محققین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان سات میں سے پانچ دریاؤں کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے۔ "سپت سندھو" پنجاب کا قدیم ترین نام ہونے کی شاہد ایرانی تصنیف (زرتشتیوں کی مذہبی کتاب) اوستا سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں "سپت سندھو" کو فارسی لب ولہجے میں "ہپتہ ہندوس" لکھا گیا ہے۔

اس کے علاوہ مختلف تاریخی ادوار میں پنجاب کے لیے مختلف نام رائج رہے ہیں۔ کچھ محققین کے نزدیک "ثَ تَ گو" ہخامنشی دور میں پنجاب کا قدیم نام تھا۔ ایک گروہ کے مطابق یہ نام پنجاب میں واقع افغانستان کے لیے موسوم تھا جب کہ دوسرا گروہ اس سے مراد پنجاب واقع پاک وہند لیتا ہے۔ "ثَ تَ گو" کے معنی سرزمین صد گاہ بتائے جاتے ہیں یعنی ایسا خطہ جہاں بیل اور گائے بکثرت پائے جاتے ہیں۔

"پنج ند" سنسکرت کے دو الفاظ "پنج" اور "ند" سے مل کر بنا ہے جس کے معنی پانچ ندیاں یا پانچ دریا ہیں۔ پنج ند کا فارسی ترجمہ پنجاب ہے اور قدیم سنسکرت ادب میں یہ لفظ خطہ پنجاب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پنج ند کا ذکر اتھر وید، مہابھارت اور اس کے بعد کے ادب میں بھی ملتا ہے۔ آج پنجند مٹھن کوٹ کے قریب اس موضع کو کہتے ہیں جہاں پانچ دریا آپس میں ملتے ہیں۔ ابتدا میں آریاؤں نے جو علاقے فتح کیے ان سب کے لیے "سندھوا" یعنی سندھ کا لفظ استعمال کیا لیکن جب وہ گنگا کے قریب پہنچے تو اس کا نام "آریہ ورت" رکھا۔

"بہلیک یاوہیک" اتھروو وید کے زمانے کا ایک قبیلہ تھا جس میں کئی دیگر قبائل بھی شامل تھے۔ جب یہ قبیلہ پنجاب میں بر سر اقتدار آیا تو اپنے قبیلے کے نام پر پنجاب کو "بہلیک یاوہیک" کا نام دیا۔ "مدر یا مدراک قبائل" نے جب پنجاب میں حکومت کی تو اس کو "مدر دیس" کے نام سے موسوم کیا۔ جب ستھین قوم نے پنجاب پر حملہ کیا اور یہاں آباد ہوئے تو پنجاب کو ٹک دیس کا نام دیا جس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس قوم کا ایک قبیلہ "ٹک" نام سے موسوم تھا جو بہت بہادر اور جنگجو تھے۔ انہوں نے یہاں عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ اس لیے اس علاقے کا نام "ٹک دیس" پڑ گیا۔ بر صغیر پاک وہند میں اسلام کی آمد کے وقت "پنجاب" کا اپنا کوئی مخصوص نام نہیں تھا بلکہ یہ ہندو سندھ کا حصہ تھا۔ عہد مغلیہ سے پہلے اس کو صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کے نام سے لکھا گیا ہے۔ تاہم شہنشاہ اکبر کے زمانے میں "پنجاب" کا نام استعمال کیا جائے لگا۔ ابو الفضل نے "آئین اکبری" اور اکبر نامہ میں پنجاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوبہ لاہور ہی اصل پنجاب ہے۔

پنجاب کا لفظ امیر خسرو کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ محمد تغلق کے عہد (1325-1351) کا مشہور سیاح ابنِ بطوطہ بھی اپنے سفر نامہ میں پنجاب کا ذکر کرتا ہے۔ مواعظ نوشہ پیر (1556-1654) میں پنجاب کا لفظ علاقے کے نام کے طور پر پہلی بار استعمال کیا گیا ہے۔ صوبے کی حیثیت سے پنجاب کا نام شیر شاہ سوری (1540-1545) کے دورِ حکومت میں رائج ہوا۔ اردو زبان کے معروف محقق حافظ محمود شیرانی کے مطابق ایرانیوں نے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقے کا نام پنجاب رکھا۔ لفظ پنجاب کا فارسی الاصل ہونا بھی اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ پنجاب کو یہ نام فارسی زبان بولنے والوں نے ہی دیا ہو گا۔ لفظ پنجاب فارسی زبان کے دو لفظوں پنج اور آب سے بنا ہے۔ اور پنجاب کے معنی پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ ان پانچ دریاؤں میں (ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم) شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ پانچ دریا مٹھن کوٹ کے مقام پر پنج ند پر آپس میں مل جاتے ہیں۔ پھر یہ دریا دریائے سندھ سے جا ملتے ہیں۔ روایتی طور پر پنجاب سے مراد پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے مگر تحقیق کے مطابق پنجاب دریائے جیحوں کے کنارے ایک مقام ہے جو کہ بلخ و ترمز کی حدود میں واقع ہے۔ یہ قول بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نام پہلے پنج دو آب تھا بعد میں "دو" کا لفظ ختم کر کے پنج آب (پنجاب) پڑ گیا، صوبے کے طور پر پنجاب کا نام شیر شاہ سوری کے دور حکومت میں رائج ہوا۔ تاریخی اعتبار سے پنجاب کا لفظ پہلی بار طبقانہ ناصری میں 457ھ (1260ء) میں دریائے سندھ کے نام کے طور پر آیا ہے۔ ابن اثر کی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں بہ نام ہنج یا فنج آب، کی

صورت میں آیا ہے 'جہاں نامہ' میں پنجاب کا ذکر ختلان اور وخش کی حدود میں دریائے جیحوں میں جس موضع کے قریب پانچ دریا ملتے ہیں اس کو پنجاب کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ تقریباً پونے دو سو سال پہلے ایران میں پنجاب نامی ایک موضع تھا۔ بلخ اور ترمذ کے لوگ جب نقل مکانی کر کے یہاں آئے ہوں گے تو انھوں نے اس پنجند کے مقام کی صورت حال دیکھ کر اس کا نام پنجاب رکھا ہو۔

پنجاب کی قدیم تاریخ ایک انتہائی دلچسپ اور متنوع ورثے پر مشتمل ہے۔ یہ خطہ انسانی تہذیب کی ابتدائی نشوونما کا مرکز رہا ہے اور مختلف ثقافتوں، قومیتوں اور حکومتوں کا مسکن رہا ہے۔ پنجاب میں انسانی آبادکاری کی شروعات قدیم تہذیبوں سے ہوتی ہے، جن میں سب سے مشہور وادی سندھ کی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب تقریباً 2500 قبل مسیح میں پروان چڑھی اور ہڑپہ، موہنجو داڑو، اور لکھی کے مقامات پر اپنے آثار چھوڑے۔ وادی سندھ کی تہذیب کے زوال کے بعد آریائی قومیں اس خطے میں آئیں۔ انہوں نے زراعت، گھروں کی تعمیر، اور مذہبی رسومات کا آغاز کیا۔ یہ دور ویدوں کی تحریر کا بھی دور ہے، جس میں پنجاب کا ذکر ملتا ہے۔ 16ویں صدی میں مغل سلطنت نے پنجاب پر حکومت قائم کی۔ اس دور میں لاہور کو ایک ثقافتی اور علمی مرکز کے طور پر ترقی دی گئی۔ مغل بادشاہوں نے شاندار باغات، قلعے، اور مساجد تعمیر کیں، جو آج بھی موجود ہیں۔

18ویں صدی کے اوائل میں سکھوں نے پنجاب میں ایک خود مختار ریاست قائم کی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1801 میں لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور ایک طاقتور سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں فنون لطیفہ، ثقافت، اور مذہبی رواداری کو فروغ ملا۔ سکھ سلطنت کے خاتمے کے بعد 1849 میں برطانوی راج نے پنجاب کو اپنی سرحدوں میں شامل کیا۔ اس دور میں جدید تعلیم، زراعت، اور بنیادی ڈھانچے کی ترقی کی گئی، مگر ساتھ ہی ساتھ پنجاب کے لوگوں کے حقوق بھی سلب کیے گئے۔ 1947ء میں پاکستان کی تشکیل کے وقت پنجاب میں بڑی ہجرتیں ہوئیں، جس سے خطے کی آبادی میں تبدیلیاں آئیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد، پنجاب نے ملک کی معاشی اور ثقافتی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ پنجاب کی تاریخ میں مختلف تہذیبوں، قوموں، اور حکومتوں کے اثرات نے اسے ایک منفرد ثقافتی ورثہ فراہم کیا ہے۔ یہ خطہ آج بھی اپنی ثقافتی و تاریخی اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

1.2 حدود اربعہ:

پنجاب کی حدود تاریخ کے مختلف ادوار میں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جہاں اس کی حکومت قائم ہوتی گئی وہ علاقے پنجاب سے ملحق قرار پائے۔ اس لیے سکھ عہد میں ڈیرہ جات،

کشمیر، بہاولپور، تبت لداخ، جموں کانگرہ، کلو اور کوہِ سلیمان بھی پنجاب کی حدود میں شامل تھے۔ خیبر پختونخواہ جسے ماضی قریب میں شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی کہا جاتا رہا ہے یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور اور اس کے بعد میں بھی پنجاب کا حصہ رہا ہے۔ اس کو 1901ء میں پنجاب سے علیحدہ کر کے صوبہ سرحد بنا دیا گیا یوں پنجاب اٹک تک محدود کر دیا گیا۔ قیام پاکستان کے وقت پنجاب کو مزید تقسیم کر دیا گیا، مشرقی حصہ بھارت کے پاس اور مغربی حصہ پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ پنجاب کو کبھی سرہند شریف سے درہِ خیبر تک، کبھی کشمیر سے کراچی تک اور کبھی لاہور تک محدود کیا جاتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے پنجاب کے نام بھی تبدیل ہوتے رہے۔ دور قدیم میں پنجاب کی سرحدیں شمال میں کوہ ہندوکش اور پیر پنجال، زنسکار اور دھولدھر تک تھی، اس کے ساتھ ہی شمال مغربی حصہ میں گندھارا اور کھمبوجہ تک پھیلی ہوئیں تھیں۔ اس کے علاوہ ضلع ہزارہ اور دریائے کرشنا گنگا کے قریب رہنے والے لوگ بھی پنجاب کا ہی حصہ تھے۔ ان تمام علاقوں میں لہجوں کے فرق کے ساتھ پنجابی مادری زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔

پاکستانی پنجاب یا مغربی پنجاب رقبے کے لحاظ سے بلوچستان کے بعد پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے اور آبادی کے لحاظ سے یہ پہلے نمبر پر ہے۔ اس کا رقبہ 205344 مربع کلومیٹر ہے۔ یہ پاکستان کے کل رقبے کا 32.8٪ ہے۔ اس کی حدود جنوب میں سندھ، جنوب مغرب میں صوبہ بلوچستان، شمال مغرب میں خیبر پختونخوا، اور شمال میں اسلام آباد اور آزاد کشمیر سے ملتی ہیں جب کہ مشرق میں بھارتی ریاست پنجاب اور راجھستان سے ملتی ہیں۔ اس کے شمال مشرق میں مقبوضہ جموں و کشمیر واقع ہے۔ لاہور جو صدیوں سے تہذیب و ثقافت، علم اور تجارت کا مرکز ہے صوبہ پنجاب کا دار لحکومت ہے۔ اسے پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ پنجاب کے دیگر اہم شہروں میں فیصل آباد، راولپنڈی، ساہیوال، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، منڈی بہاوالدین، گجرات ، بہاولپور، ملتان، شیخوپورہ اور جہلم شامل ہیں۔ پاک بھارت سرحد ریاست راجھستان کے قریب صحرائے تھل اور چولستان واقع ہیں۔

2023ء کی مردم شماری کے مطابق صوبہ پنجاب کی کل آبادی 12 کروڑ 76 لاکھ 88 ہزار 922 ہے اور یہاں کی شرح خواندگی 62.8 فیصد ہے۔ پنجاب ریونیو ڈیپارٹمنٹ کے دسمبر 2022ء کے ریکارڈ کے مطابق پنجاب کو انتظامی لحاظ سے 10 ڈویژنز، 41 اضلاع اور 149 تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر تحصیل کو مزید یونین کونسلز میں تقسیم کر کے چھوٹے انتظامی یونٹ بنا دیئے گئے ہیں۔

1.3 لسانی جغرافیہ:

پانچ دریاؤں کے درمیان کے علاقوں میں بولی جانے والی زبان پنجابی زبان کہلاتی ہے۔ پنجابی زبان برصغیر پاک و ہند کے دور دراز علاقوں میں قدیم زمانے سے بولی جاتی ہے۔ پنجابی زبان دہلی سے خیر پور اور پشاور سے لے کر جموں، کشمیر اور سری نگر مقبوضہ کشمیر کی حدود تک بولی جاتی ہے مگر علاقائی تناسب کے لحاظ سے لہجوں میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس وقت پنجابی زبان نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ یہ زبان کینڈا، آسٹریلیا، انگلینڈ، امریکا، افریقہ اور عرب ممالک میں بھی پہنچ چکی ہے۔ راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں شمال مغربی صوبہ خیبر پختونخواہ بھی پنجاب کا حصہ تھا اس صوبے کو 1901 میں پنجاب سے الگ کیا گیا۔ قیام پاکستان کے وقت صوبہ پنجاب کو مزید تقسیم کر دیا گیا۔ سکھ اور ہندو رہنماوں نے پنجاب کی تقسیم کے حق میں ووٹ دیا یوں صوبہ پنجاب، بھارت اور پاکستان میں منقسم ہو گیا۔ بھارتی پنجاب کو مزید تین ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا، ہریانہ، ہماچل پردیش اور پنجاب۔ پاکستانی پنجاب کی حدود ایک طرف تو مقبوضہ کشمیر کو چھوتی ہیں اور دوسری طرف بھارتی سرحد کے ساتھ ہے۔ ان تمام علاقوں میں پنجابی زبان کے مختلف لہجے بولے جاتے ہیں۔ پنجابی زبان جنوب میں بیکانیر و جیسلمیر اور دریائے سندھ کے مشرق میں واقع بالائی سندھ تک بولی جاتی ہے۔ مشرق میں دریائے جمنا کے مغرب میں تھانیسر سرہند تک اور مغرب میں دریائے سندھ کے دوسری طرف درہ بولاں تک پنجابی زبان ہی بولی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی کے مطابق پنجابی زبان کے آثار مغرب میں جلال آباد تک ملتے ہیں۔ درشن سنگھ کے بقول روسی آذربائیجان کے دالحکومت "باکو" تک یہی زبان بولی جاتی تھی۔ تحقیق کاروں کی تحقیق کے مطابق کافرستان میں لہندی پنجابی چینی، ترکستان، تاجکستان کی وادیِ گسار میں فرغانہ اور تاشقند کے قبائل پنجابی زبان بولتے ہیں۔ یورپی ممالک میں رہنے والے خانہ بدوش یا جپسی قبائل کی زبان کا لہجہ اور الفاظ بھی پنجابی کی طرح ہی بولے جاتے ہیں۔

1.4 پنجابی زبان کا آغاز وارتقاء:

دورِ حاضر سے کروڑوں سال پہلے پنجاب کا علاقہ برف سے گھرا ہوا تھا اور کوہ ہمالیہ ابھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے سائبرین ہوائیں پنجاب پر اثر انداز ہوا کرتی تھیں۔ پھر سمندر خشک ہونے لگ پڑا اور ہمالیہ ظاہر ہونے لگا۔ کوہ ہمالیہ کی اونچائی کی وجہ سے سائبرین ہوائیں رُک گئیں۔ پنجاب کی زمین پر سے برف پگھل گئی اور ہر طرف پانی پانی ہو گیا۔ اس پانی کی وجہ سے پودے، جھاڑیاں اور گھاس نمودار ہو گئی اور ہر طرف سرسبز و شادابی نظر آنے لگی۔ سرسبز شادابی دیکھ کر افریقی قبیلے نیگیر ائیڈ نے یہاں رہنا شروع کیا پھر آسٹرائیڈ قبیلے نے اپنا مسکن بنایا یہ لوگ سیاہ کالے رنگ اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ یہ لوگ جنگلی جانوروں سے مشابہت رکھتے

تھے۔ نیگرائیڈ اور آسٹرائیڈ قبیلوں نے پنجاب کے مختلف جنگلوں میں رہائش اختیار کی۔ اس کے بعد ساورا، کوروال، کول، بھیل، مانگ اور سنتھال قبیلے یہاں آباد ہوئے۔ان قبائل کو منڈا قبائل کہا جاتا ہے۔ مُنڈا منڈاری زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

منڈاری زبان پہلی زبان ہے جو اس علاقے میں بولی جاتی تھی اور اس زبان کے الفاظ اب بھی پنجابی زبان میں بولے جاتے ہیں اس لیے منڈاری زبان ہی پنجابی زبان کا مآخذ سمجھی جاتی ہے۔ دورِ حاضر سے چھ ہزار سال پہلے منڈا قبائل کی وجہ سے آمری نال تہذیب کو عروج حاصل ہوا۔ اس تہذیب کے بعد پانچ ہزار سال پہلے بحیرہ روم میں دراوڑ قوم آکر آباد ہوئی جن کی زبان براہوی تھی اور یہ دراوڑی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ دراوڑوں نے پنجاب کا رخ کیا اور یہاں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ درختوں، شیولنگ اور سائیوں کی پرستش کرتے تھے۔ یہ دراوڑی زبان بولتے تھے جس کی شاخیں گونڈی، کنڈی، کوٹی، تیلگو، ملیالم، تامل، کرخ اور بلتی ہیں جو کہ اب بھی بولی جاتی ہیں۔

عین الحق فرید کوٹی کے مطابق پنجابی زبان سنسکرت سے نہیں بلکہ منڈاری اور دراوڑی سے نکلی ہے۔ منڈاری اور دراوڑی زبانوں کے آپس میں ملنے سے پشاچی زبان وجود میں آئی۔ دراوڑ جب پنجاب میں آئے تو اس کے ساڑھے تیس ہزار سال بعد وسطی ایشیا کے علاقے سے ایک قوم سندھ اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں رہائش پذیر ہوئی اس قوم کو آریہ کہتے ہیں۔ یہ آریہ لوگ 1500 ق م سے کر 1000 ق م تک برصغیر ہندوستان میں داخل ہوئے، ان کی زبان کو ویدک یا ویدی کہا جاتا تھا۔ آریہ قوم کی پہلی مذہبی کتاب جو پنجاب میں لکھی گئی ''رگ وید'' کہلاتی ہے۔ آریہ خود کو بہت ارفع و اعلیٰ تصور کرتے تھے۔ ان کی زبان کا نام سنسکرت تھا جو کہ مقدس مانی جاتی تھی۔ منڈا اور دراوڑ قبیلے اپنی اپنی زبانیں بولتے تھے، ان زبانوں کو پراکرت کہا جاتا تھا۔ پراکرتوں میں ماگدھی، مہاراشٹر، برج بھاشا، شور سینی، کھڑی اور پشاچی بولی شامل تھی۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول پراکرت پشاچی ہے جو کہ پشاچہ میں بولی جاتی تھی اسی وجہ سے اس زمانے میں پنجاب کا نام پشاچہ پڑ گیا تھا۔

پشاچی زبان میں سے کشمیری اور پنجابی نے جنم لیا۔ پالی زبان پشاچی کی ادبی شکل ہے اور پالی زبان ٹیکسلا کی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی تھی۔ ایک تحقیق کے مطابق خانہ بدوشوں کا اصل وطن پنجاب ہے اور ان خانہ بدوشوں کی زبان جسکا پنجابی سے خاص تعلق ہے اس کا نام ''روما'' ہے یہ خانہ بدوش لوگ پنجاب سے ہجرت کر کے یورپی ممالک میں جا بسے۔ پنجابی زبان نے اپ پھرنش کے ذریعے اپنے سفر کا آغاز تب کیا جب 712ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تو آہستہ آہستہ عربی کے کثیر الفاظ پنجابی زبان میں شامل ہو گئے، آج کی پنجابی زبان

اسلامی عہد کی یادگار ہے اور بعد ازاں مغلوں کے آنے سے پنجابی زبان کو اور زیادہ تقویت ملی اور اس میں فارسی زبان کے بہت سے الفاظ شامل ہو گئے۔

1.5 پنجابی زبان کا رسم الخط اور حروف تہجی:

پنجابی زبان کے رسم الخط کی تاریخ ایک دلچسپ سفر ہے جو مختلف ادوار اور مقامات کے اثرات سے متاثر ہوئی ہے۔ پنجاب میں پنجابی زبان کے لیے مختلف اسکرپٹس کا استعمال ہوتا رہا ہے، جن میں "گرمکھی" اور "شاہ مکھی" اسکرپٹ اہم ہیں۔

گرمکھی اسکرپٹ:

گرمکھی اسکرپٹ کا آغاز 16 ویں صدی میں ہوا جب سکھ مذہبی رہنما گرو انگد یو جی نے اسے فروغ دیا۔ اس اسکرپٹ کو سکھ مت کی مقدس کتابوں کو لکھنے کے لیے استعمال کیا گیا، جن میں "گرو گرنتھ صاحب" بھی شامل ہے۔ گرمکھی اسکرپٹ زیادہ تر بھارتی پنجاب میں استعمال ہوتا ہے اور یہ مختلف آوازوں کو ضبط میں لانے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ یہ رومن رسم الخط کی طرح دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے اور مکمل حروف پر مشتمل ہوتا ہے۔

شاہ مکھی اسکرپٹ:

شاہ مکھی اسکرپٹ کا اصل تعلق فارسی اور اردو اسکرپٹ سے ہے۔ یہ پاکستانی پنجاب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ شاہ مکھی اسکرپٹ کا استعمال مسلم آبادی کے درمیان زیادہ ہوتا ہے۔ شاہ مکھیدراصل اُردو اسکرپٹ ہے۔ اس کو لکھنے کا طریقہ وہی ہے جو اردو کا ہے یعنی مکمل حروف کی بجائے اُن کی چھوٹی اشکال سے لفظ تحریر کیے جاتے ہیں۔ یہ دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے اور اس میں مختلف فارسی اور عربی حروف کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

پنجابی زبان کے اسکرپٹ کا انتخاب زیادہ تر مذہبی اور سیاسی اثرات کے زیر اثر ہوتا رہا ہے۔ سکھوں کے لیے گرمکھی اسکرپٹ ان کے مذہبی تعلقات اور پہچان کا حصہ بنا، جبکہ مسلم پنجابی آبادی نے شاہ مکھی کو اپنایا جو ان کے فارسی اور اردو سے قریبی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ برطانوی راج کے دوران بھی ان اسکرپٹس کا الگ الگ استعمال جاری رہا، اور آج تک یہ دونوں اسکرپٹس اپنے اپنے علاقوں میں فروغ پا رہے ہیں۔ اس طرح، پنجابی زبان کے اسکرپٹس کی تاریخ مذہبی اور مختلف تہذیبی اثرات کا نتیجہ ہے، جو اس علاقے کے مذاہب کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

حروف تہجی:

پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان کے لیے وہی حروف تہجی یا تختی مستعمل ہے جو اُردو زبان کی ہے۔ جس سے ان دونوں زبانوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا ہوئی ہے تاہم اس تختی میں پنجابی کی مخصوص آوازوں کے لیے کوئی حروفِ تہجی مختص نہیں ہیں۔ وہ حروف یہ ہیں:

ب + پ کی مخلوط آواز جس کو لکھا 'ب' سے جاتا ہے جب کہ تلفظ کی ادائیگی کے وقت وہ آواز "پ" کے زیادہ قریب ہوتی ہے مثلاً بہن کو پنجابی میں بھین لکھا جاتا ہے جبکہ بولنے میں یہ آواز "پین" کے زیادہ قریب ہے۔ اس طرح مندرجہ ذیل آوازیں ہیں:

د + ت کی مخلوط آواز

و + بکی مخلوط آواز

ن + اڑنون کی مخلوط آواز

ڈ + ٹ کی مخلوط آواز

ج + چ کی مخلوط آواز

ک + گ کی مخلوط آواز

1.6 پنجابی زبان کے علاقائی لہجے (ڈائیلیکٹس):

پنجابی زبان ایک وسیع و عریض خطے میں بولی جاتی ہے اور جو زبان جتنی زیادہ جغرافیائی وسعت کی حامل ہو گی، اُس کے لہجے، تلفظ اور ادائیگی میں اتنا ہی تفاوت ہو گا مگر پنجابی زبان اپنے الفاظ اور لہجے کے اختلاف کے باوجود ایک جیسی ہی ہے۔ ماہرینِ لسانیات کے مطابق زبان ہر بارہ کوس کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی لوگ ایک دوسرے کی زبان کو سمجھ لیتے ہیں۔ جان نیوٹن کے مطابق دریائے سندھ اور ان کے درمیان والے علاقے کی بولی کو پنجابی کہا جاتا ہے۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ماہرین لسانیات و محققین نے پنجابی زبان کی بولیوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

1 مرکزی بولی

2 مشرقی بولیاں

3 مغربی بولیاں

ان گروہوں میں بولی جانے والی بولیوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔ مرکزی گروہ:

مرکزی گروہ سے مُراد معیاری یا ٹکسالی لہجہ ہے اور پنجابی زبان کا معیاری لہجہ ماجھی بولی کو شمار کیا جاتا ہے۔ یہ بولی دریائے بیاس اور راوی کے درمیان بولی جاتی ہے۔اس میں گُرداس پور، لاہور، امرتسر، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اضلاع شامل ہیں۔اب یہ بولی شیخوپورہ، قصور، گجرات تک پھیل گئی ہے۔اس بولی کو معیاری ٹیکسالی زبان کا درجہ مل چکا ہے۔ماجھی زبان ماجھی اور ملتانی بولیوں کے میل ملاپ سے وجود میں آئی۔ قدما سے لے کر جدید مسلم، سکھ شاعروں نے ادب میں اسی زبان کا سہارا لیا ہے۔وارث شاہ اور بلھے شاہ نے بھی اسی لہجے کو اپنایا۔ماجھی زبان کے لہجے میں لہندی اور اُردو کا اثر دکھائی دیتا ہے اور یہ پنجاب کے کونے کونے میں سمجھی جاتی ہے۔

2۔ مشرقی گروہ:

اس گروہ میں بھارتی پنجاب میں بولی جانے والی پنجابی زبان کے مختلف لہجے شامل ہیں۔

1۔ بھٹیانی:

یہ لہجہ گوڑ گاؤں، حصاراور بیکانیر میں بولا جاتا ہے، لہندی کا اثر ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ جاسوں، تھارو، مارو جیسے الفاظ ادا کرتے ہیں یہ باگڑی بولی سے ملتی جلتی ہے۔

2۔ پوادھی:

یہ بولی جنید، پٹیالہ، انبالہ اور کلیر شریف میں بولی جاتی ہے۔ لہندی و باگڑی کا اثر ہونے کی وجہ سے مجھے تجھے کے لیے تنے منے اور ہمارا تمہارا کے لیے ہمانوں تمانوں اور آگے کے لیے اگے جیسے الفاظ بولے جاتے ہیں۔

3۔ مالوی یا ملوئی:

فرید کوٹ، مالیر کوٹلہ اور فیروز پور میں بولی جاتی ہے۔ یہ ''و'' کو ''ب'' میں بولتے ہیں جیسے ویاہ کو بیاہ تیویں کو تیمی (عورت) اور اس ویلے کو اتے ویلے (اُس وقت)۔

4۔ دوآبی:

دریائے ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقے کو دوآبہ کہا جاتا ہے اور اس میں دوآبی بولی جاتی ہے۔یہ لدھیانہ، کپورتھلہ اور جالندھر میں بولی جاتی ہے یہ بھی وکوب بولتے ہیں، یہ گھی کو گھے، بڑے کو بڈ اور وجدے کی جگہ بجدا جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

5۔ پہاڑی:

پہاڑی بولی شملہ، کانگڑہ اور جموں کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اسے ڈوگری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پوٹھوہاری سے ملتی جلتی ہے۔ ہماچل پردیش کی بولی کو بھی پہاڑی میں ہی شامل کیا جاتا ہے۔

6۔ مغربی گروہ:

اس گروہ میں پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان کے جو لہجے رائج ہیں وہ شامل ہیں، ان میں چھاچھی، دھنی، شاہ پوری، جھنگوی، ریاستی، ملتانی اور پوٹھوہاری وغیرہ کو شمار کیا جاتا ہے۔

پوٹھوہاری:

یہ پوٹھوہار کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ یہ پنجاب کا شمالی حصہ ہے اس کے لغوی معنی سطح مرتفع کے ہیں۔ یہ زبان جہلم، سوہاوہ، گوجر خان، کلر سیداں، مری، ٹیکسلا، اٹک، چکوال کے علاقوں میں بولی جاتی ہے، پوٹھوہاری زبان پنجابی زبان کی قدیم بولی ہے۔

اس میں مگھی تگھی، ونجسی، اچھنا گچھنا وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

دھنی:

دھنی بولی چکوال ضلع میں بولی جاتی ہے۔ اسے دھنوچی بھی کہا جاتا ہے۔ وادیِ سون سکیسر کے ختم ہونے کے ساتھ ہی دھن شروع ہو جاتا ہے اس لہجے کی نشانی 'وت' کا زیادہ استعمال ہوتا ہے اس بولی کا لہجہ ڈھوک ٹاہلیاں سے کلر کہار تک ایک جیسا ہی ہے۔

چھاچھی:

چھچھ ضلع اٹک کا علاقہ کہلاتا ہے اور اسی مناسبت سے یہاں کی بولی چھاچھی کہلاتی ہے جو حضرو، اٹک، ہزارہ، غورغشی وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ اٹک کے علاقے میں چھاچھی کے علاوہ جنڈالی لہجہ (کالا اور چٹا پہاڑ کے جنوب مغرب میں جنڈ تحصیل کا لہجہ جو پشتو اور کوہاٹی ہندکو کے زیرِ اثر ہے) بولا جاتا ہے۔ پنڈی گھیب تحصیل کا لہجہ گھیبی کہلاتا ہے۔ ہزارہ میں ہندکو بولی جاتی ہے جو چھاچی سے مختلف ہے۔ اس لیے اس کو پوٹھوہاری کی ذیلی شاخ بھی قرار دیا جاتا ہے۔

جھنگی شاہ پوری بولی:

ضلع جھنگ کی بولی کو جھنگی یا جھنگوی کہا جاتا ہے۔ اس زبان کو لہندی کہنا چاہیئے کیونکہ یہ نہ پوٹھوہاری نہ ہی ملتانی ہے مگر ان کے کچھ الفاظ اس میں موجود ہیں۔ آج کل یہ شاہ پور، خوشاب، جھنگ، میانوالی اور فیصل آباد میں بولی جاتی ہے۔ اس پر سرائیکی اور دھنی کا اثر اس کی رنگینی اور دلکشی بڑھاتا ہے۔

جانگلی:

جانگلی چیچہ وطنی، ساہیوال، شیخوپورہ، ننکانہ، کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بولی جاتی ہے۔ یہ بولی جنگل بار کی بولی کہلاتی ہے۔ اس کو پنجابی کی قدیم ترین بولی کہا جاتا ہے۔ یہ ساندل بار، نیلی باراور گنجی بار کے لوگوں کی بولی ہے۔ یہ لوگ غیر ملکی حملہ آوروں سے جان بچا کر جنگل میں آکر چھپ گئے اس لیے ان کی بولی کو جانگلی کہا جاتا ہے اور اس بولی کو پنجابی زبان کا قدیم ترین لسانی سرمایہ قرار دیا جاتا ہے۔

خود آزمائی

1. پنجاب کی تاریخ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. پنجاب کا حدود اربعہ بیان کیجیے نیز صوبہ پنجاب کے اہم شہروں کے نام بھی بتائیے۔
3. پنجابی زبان کہاں کہاں بولی جاتی ہے؟
4. پنجابی زبان کے ڈائیلکٹس کون کون سے ہیں اور اس زبان کا معیاری لہجہ بھی بتائیے۔
5. پنجابی زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں وضاحت کیجیے۔

یونٹ نمبر:2

پنجابی تہذیب و ثقافت

تحریر:ڈاکٹر عائشہ رحمان

اضافہ و نظر ثانی:ڈاکٹر زیب النساء

فہرست

	یونٹ کا تعارف	26
	مقاصد	26
2.1	تہذیب اور ثقافت	27
2.2	تہذیبی پس منظر	29
2.3	پنجابی تہذیب و ثقافت کے اہم خدوخال	30
2.4	رسم و رواج	32
2.5	عُرس و میلے	36
2.6	پنجاب کے روایتی کھیل	40
2.7	پنجاب کے لوک رقص	41
	خود آزمائی	44

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

پنجابی تہذیب و ثقافت رنگارنگ اور دلکشی سے بھرپور ہے جو قدیم تاریخ، روایات، اور رسم ورواج کا مجموعہ ہے۔ یہ ثقافت پنجاب میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی ہے، چاہے وہ ان کی زبان ہو، فنون لطیفہ، لوک موسیقی، رقص، یا کھانے پینے کے انداز ہوں۔ پنجابی معاشرت میں محبت، بھائی چارہ اور مہمان نوازی کی ایک مضبوط روایت ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی محنت، جرات اور خوش مزاجی کے لیے پہچانے جاتے ہیں، اور ان کی ثقافت مختلف تہواروں، میلوں اور تقریبات کے ذریعے ایک خوبصورت انداز میں سامنے آتی ہے جس کے بارے میں آپ اس یونٹ میں پڑھیں گے۔

مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ تہذیب و ثقافت کی تعریف کر سکیں اور ان کے مابین فرق سمجھ سکیں۔
2۔ پنجابی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہو سکیں۔
3۔ پنجاب کے اہم عُرسوں کے بارے میں جان سکیں۔
4۔ پنجاب کے روایتی کھیلوں کے بارے میں علم حاصل کر سکیں۔
5۔ پنجاب کے لوک اور روایتی رقص کے بارے میں جان سکیں۔

پنجابی تہذیب و ثقافت

2.1 تہذیب اور ثقافت:

تہذیب اور ثقافت دو ایسے تصورات ہیں جو کسی قوم یا معاشرت کے اخلاقی، معاشرتی اور ثقافتی اقدار کو بیان کرتے ہیں۔ تہذیب ایک مخصوص طرز زندگی اور اخلاقی رویوں کا مجموعہ ہے جو معاشرے میں لوگوں کے اخلاقی معیار، ادب آداب، اور سوچ کے زاویوں کو ظاہر کرتی ہے۔ تہذیب اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے کیسے پیش آتے ہیں، بڑوں کا احترام، بات کرنے کا انداز، اور روایات کا احترام کس طرح کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی اصولوں اور اقدار کا ایک نچوڑ ہوتا ہے جو معاشرے کو منظم رکھتا ہے۔

ثقافت ایک وسیع تصور ہے جس میں لوگوں کی زبان، فنون، روایات، رسم و رواج، اور عمومی طرزِ زندگی شامل ہوتے ہیں۔ یہ کسی قوم کے تخلیقی اور فنی پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ثقافت کا تعلق ایک مخصوص علاقے، نسل یا قوم کے ماضی، روایات، تہواروں اور اس کی روزمرہ زندگی سے ہوتا ہے۔ اس میں موسیقی، رقص، لباس، کھانے پینے کے طریقے، فنون لطیفہ، اور مذہبی عقائد بھی شامل ہیں۔ یوں تہذیب اور ثقافت مل کر ایک معاشرت کو شناخت دیتے ہیں اور لوگوں کی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ تہذیب اور ثقافت دو الگ مگر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تصورات ہیں۔ دونوں کا تعلق معاشرتی زندگی، روایات، اور اقدار سے ہوتا ہے، لیکن ان کے دائرہ کار اور اثرات میں فرق ہوتا ہے۔

تہذیب:

تہذیب ایک معاشرتی اور اخلاقی تصور ہے جو کسی قوم یا معاشرے کے لوگوں کے رویوں، اخلاقی اصولوں، اور آداب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ تہذیب بنیادی طور پر اس بات کی عکاس ہوتی ہے کہ ایک شخص یا قوم کس طرح اپنے اندرونی اخلاقی معیاروں اور بیرونی رویوں میں توازن برقرار رکھتی ہے۔

تہذیب کی خصوصیات:

ادب و آداب:

تہذیب کا مطلب ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے شائستگی سے پیش آئیں، بڑوں کا احترام کریں، اور معاشرتی اصولوں کی پیروی کریں۔

اخلاقیات:

تہذیب میں اخلاقی رویوں کا ایک اہم کردار ہوتا ہے، جیسے سچ بولنا، انصاف کرنا، اور دوسروں کی مدد کرنا۔

معاشرتی اصول:

تہذیب میں معاشرے کے اصول وضوابط کا احترام کیا جاتا ہے جو کہ لوگوں کے باہمی تعلقات کو منظم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، ہاتھ ملانا، احترام سے بات کرنا، اور کسی کی رائے کا احترام کرنا تہذیب کے اہم عناصر ہیں۔

ثقافت ایک وسیع تر تصور ہے جس کا تعلق کسی قوم کی مجموعی زندگی، طرزِ زندگی، فنون، روایات، رسم و رواج، اور زبان سے ہوتا ہے۔ ثقافت کسی مخصوص قوم یا علاقے کے لوگوں کی اجتماعی عادات، طرز فکر، اور روزمرہ زندگی کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ثقافت کی خصوصیات:

فنون لطیفہ:

موسیقی، رقص، مصوری، اور دیگر فنون ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں۔

رسم ورواج:

معاشرتی تقریبات، تہوار، شادی بیاہ کی رسومات اور دیگر معاشرتی سرگرمیاں ثقافت کی بنیاد ہیں۔

زبان اور لباس:

زبان، لباس، اور کھانے پینے کے طریقے بھی ثقافت کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔

علاقائی شناخت:

ثقافت کسی قوم یا علاقے کی شناخت کا ذریعہ ہوتی ہے اور اس کا تعلق کسی خاص جغرافیائی خطے سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، پاکستان کی ثقافت میں اردو زبان، قومی لباس شلوار قمیص، اور عیدین جیسے تہوار شامل ہیں۔

تہذیب وثقافت کے درمیان فرق:

تہذیب کا دائرہ کار زیادہ تر افراد کے اخلاقی اور معاشرتی رویوں تک محدود ہوتا ہے، جبکہ ثقافت ایک قوم کی مجموعی زندگی، فنون، زبان، رسم ورواج اور تاریخ کی عکاسی کرتی ہے۔ تہذیب کا تعلق زیادہ تر انسان کے اخلاقی رویوں اور شائستگی سے ہوتا ہے، جب کہ ثقافت میں فنون، لباس، زبان، اور دیگر ثقافتی پہلو شامل ہوتے ہیں۔ تہذیب افراد کے باہمی تعلقات اور ان کی معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے پر زور دیتی ہے، جبکہ ثقافت کسی قوم کی اجتماعی شناخت اور تاریخ کو اجاگر کرتی ہے۔ تہذیب عام طور پر انفرادی اور معاشرتی رویے میں نظر

آتیہے، جبکہ ثقافت اجتماعی سطح پر قوموں اور علاقوں کی پہچان بناتی ہے۔اس طرح تہذیب زیادہ انفرادی اور اخلاقی کردار کا حصہ ہے جبکہ ثقافت اجتماعی زندگی اور فنون کا نمائندہ ہے۔

2.2 تہذیبی پس منظر:

پانچ دریاؤں کی سرزمین جسے "پنجاب" کا نام دیا جاتا ہے کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ دُنیا میں جب اکثر ممالک کے لوگ تہذیب و اخلاق سے آراستہ نہیں تھے اُس وقت جنوبی ایشیا کے اس خطے میں اعلیٰ تہذیب و تمدن کے آثار ہڑپہ اور موہنجو داڑو میں موجود تھے۔ اس ترقی یافتہ تہذیب سے وابستہ لوگ طرز تعمیر کے جدید طریقوں سے واقف تھے چنانچہ ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے کھنڈرات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تقریباً چار ہزار قبل مسیح کے یہ لوگ نکاسی آب، غلے کو محفوظ کرنے کے لیے زیر زمین گودام بنانے اور ہوادار عمارتوں کی تعمیر میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ یہاں کے لوگ علم و ادب، سیاست و حکمت، ناچ، گیت، ناٹک اور فلسفے کے علاوہ روزمرہ زندگی سے متعلق علم وہنر اور فنون لطیفہ میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

326 قبلِ مسیح میں یونان سے سکندر اعظم نے پنجاب پر حملہ کیا لیکن دریائے بیاس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اسکے بعد چندر گپت موریا کے شہنشاہوں نے یہاں تقریباً ڈیڑھ سو سال حکومت کی جن میں سے راجہ اشوک کا عہد قابل ذکر ہے۔ نو سو سالوں تک پنجاب پر مختلف ایشیائی قبیلوں نے وقتاً فوقتاً حملے کیے اور وقت کے ساتھ ساتھ شکست خوردہ ہو کے ناکامی کا سامنا کرتے رہے، ساتویں سے گیارہویں صدی عیسوی تک پنجاب پر کئی خود مختار حاکم حکومت کرتے رہے جبکہ گیارہویں سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک پنجاب پر مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ اس دوران سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں نے جہاں تباہی و بربادی کی تاریخ رقم کی وہیں پنجاب کو بھی بہت نقصان پہنچا۔ غوری حکمرانوں کے بعد سلطنت غلاماں، خلجی، تغلق، سادات، لودھی اور سب سے آخر میں مُغل بادشاہوں کی حکومت رہی، ان حکمرانوں میں سے بالخصوص مُغل شہنشاہوں نے پنجاب کو سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی غرض یہ کہ ہر لحاظ سے ترقی یافتہ بنانے میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ البتہ اسی دوران احمد شاہ درانی اور نادر شاہ ایرانی کے حملوں نے بھی پنجاب کو کافی نقصان سے دوچار کیا۔ 1801ء میں پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1839ء تک پنجاب پر حکومت کی۔ 1849ء میں انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت برطانوی حکومت کا پنجاب کو دو حصوں (مشرقی و مغربی پنجاب) میں تقسیم کرنا اصل میں اسے دولخت کرنے کے مترادف ثابت ہوا۔ باجود اسکے مشرقی پنجاب (انڈیا) اور مغربی پنجاب (پاکستان) دو ملکوں کی سرزمین میں بٹ گئے لیکن جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی اور رسم و رواج کے اعتبار سے آج بھی ایک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کی سرزمین میں تہذیبی و

ثقافتی لحاظ سے رنگارنگی اور ہم آہنگی موجود ہے کیونکہ یہ خطہ اپنی زرخیزی اور خوشحالی کی بنا پر شروع سے ہی مختلف قسم کے لوگوں، نسلوں اور قبیلوں کا مسکن رہا ہے۔

بیرونی حملہ آوروں کا شمال مغرب کے راستے یہاں داخل ہو کر لوٹ مار کرنا اور پھر واپس چلے جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان میں داخلے کے لیے اسے بطور صدر دروازہ اختیار کیا جاتا تھا لہٰذا پنجاب کے لوگوں نے اپنے آپ کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ کرنے اور ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے فنونِ جنگ میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو جسمانی لحاظ سے طاقتور اور چست بنانے پر بھی توجہ دی۔ پنجاب کے نڈر اور بہادر نوجوان غذائیت سے بھرپور خوارک کھانے کے شوقین ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کی محنت، جفاکشی اور طاقت کی بھی مثال دی جاتی ہے۔ پنجاب کے یہ محنت کش، سادہ دل لیکن نڈر لوگ دن بھر محنت و مشقت کرتے، تازہ اور سادہ خوارک کھاتے، صاف ستھرے ماحول میں سانس لیتے، رات کو اکٹھے ہو کر چوپال / دارے میں بیٹھ کر دن بھر کی تھکن آپس میں بات چیت کر کے اتارتے اور پھر صبح سویرے ایک نئے ولولے اور جوش و جذبے سے اپنے دن کا آغاز کرتے۔ گاؤں کی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ سخت محنت کرتیں۔ گھر کے کام کاج، بچوں کی دیکھ بھال سے لے کر کھیتوں میں مردوں کے لیے کھانا لے کر جانا اور کھیتی باڑی میں مردوں کا برابر ساتھ دینا ان پنجاب کی عورتوں کا خاصا رہا ہے۔ اس طرح پنجاب کی عورتیں اور مرد مل کر ایک مشترکہ تہذیبی نظام بناتے ہیں۔

2.3 پنجابی تہذیب و ثقافت کے اہم خدوخال:

پنجاب کے اس خطے میں لوگوں کا بڑا پیشہ اور ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کے لوگ کھیتی باڑی اور اس سے متعلق فنون یعنی ہتھیار و اوزار بنانے اور انکے استعمال میں خوب مہارت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دستکاری کے فن میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ پنجاب کے لوگ زیادہ تر گاؤں میں رہتے ہیں۔ لہٰذا مٹی کے ظروف اور ان جیسی چیزوں میں مہارت ان کا خاصا رہا ہے۔ پنجاب کی تقسیم کے بعد یہاں گاؤں کی سماجی و اقتصادی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑا۔ تجارت اور زراعت کے پیشے میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مشرقی و مغربی پنجاب کے لوگوں نے آپسی روابط کی بنا پر ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا اور مختلف پیشوں میں نہ صرف اصلاحات کیں بلکہ تجارت و کھیتی باڑی میں نئی تکنیک کے استعمال سے پیداواری صلاحیت میں اضافہ بھی ہوا۔

پنجاب کی سرزمین کو برصغیر کے سر کا "تاج" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ واحد خطہ ہے جہاں کی حکمرانی کو پورے ہندوستان کی حکمرانی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یہ خطہ اپنی زرخیزی، اعلیٰ تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی خصوصیات،

مردوں کی مردانگی اور عورتوں کی نازکی کے ساتھ ساتھ انکی شرم وحیا اور دلیری کے باعث دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ یہاں کے مردوں کی غیرت اور نڈر پن کے قصے لوک کہانیوں میں بھی ملتے ہیں۔ پانچ دریاؤں کی یہ سرزمین یہاں کے رہنے والوں کے خلوص، محبت اور مہمان نوازی کی وجہ سے بھی جانی پہچانی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بولی جانے والی زبان پنجابی بھی بہت میٹھی اور رسیلی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ پنجابی زبان میں لکھے گئے ادب بالخصوص قصہ ادب اور کلاسیکی شاعری میں جہاں ایک طرف عوامی سچائیاں اور اخلاقیات کا درس ملتا ہے وہیں دوسری طرف حُسن و عشق اور جوانی سے بھرپور جذبات و احساسات بھی اپنی پوری رعنائی سے آشکار ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جانب اگر "مرزا صاحباں" کا رومانوی عشق، مرزے کی دلیری کا لبادہ اوڑھے پنجاب کے مردوں کی مردانگی کو للکارتا ہے تو دوسری جانب قصہ ہیر رانجھا میں "ہیر" کی دلیری اور ہمت پنجاب کی مٹیاروں (نوجوان لڑکیاں) کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ کبھی اس دھرتی کے قصہ گو شاعر شہزادہ "سیف الملوک" اور "پری بدیع الجمال" کے قصے کو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جہد مسلسل کے روپ میں پیش کرتے ہیں تو کبھی سسی پنوں کے لازوال عشق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب خوبصورت اور دلفریب قصے اسی پنجاب کی دھرتی پر جنم لینے والے قادرالکلام شاعروں کی دین ہیں۔

دنیا کی کوئی بھی زبان ہو یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے بولنے والوں کی تہذیب اور ثقافت کی امین ہوتی ہے۔ جس کا ثبوت پنجاب میں بسنے والوں کی زبان پنجابی ہے جو ایک طرف بہت ہی میٹھی اور رسیلی ہے وہیں دوسری جانب ایک تیکھی اور طاقتور زبان کے طور پر اپنی ایک منفرد پہچان بھی رکھتی ہے۔ اسکی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ یہ خطہ مختلف عادات و مزاج اور رسم و رواج رکھنے والے قبیلوں اور قوموں کی آماجگاہ رہا ہے لہٰذا اس خطے اور یہاں بسنے والوں پر اس کے اثرات بھی واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا مطالعہ اسکے کلچر، رسم و رواج، عادتوں اور مزاج سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کی عکاسی اس کے زبانو ادب کے ذریعے بخوبی ہوتی ہے۔ اب یہ ادب چاہے تحریری ہو یا زبانی، دونوں اپنے معاشرے کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ معاشرے اور قوم کے سماجی مقام و مرتبے اور اس کی اصلی شکل دیکھنے کے لیے وہاں کا لوک ورثہ یا لوک ادب بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی معاشرے کے رہنے والوں کے مزاج، رویوں، عادات، نفسیات اور کردار کو جتنا گہرائی اور سادگی سے لوک ورثہ اور لوک ادب کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے شاید وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہ ہو چنانچہ لوک ورثہ یا لوک ادب کو سماج کا آئینہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

2.4 رسم ورواج:

پنجاب کے لوک ورثے کو جاننے کے لیے یہاں کی رسموں اور روایات کا جاننا از حد ضروری ہے۔ لوک رسموں کو یعنی لوگوں کے انداز زندگی میں مختلف خوشی اور غم کے مواقع پر پیش آنے والے حالات اور ان کو نبھانے کے مختلف انداز اور طریقوں سے مامور کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایسی لوک رسمیں ہوتی ہیں جو کسی بھی معاشرے کی اچھائی اور برائی سے مزین مختلف نوعیت کے پہلوؤں کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرف اگر معاشرے کو اصلاح کی جانب راغب کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں تو دوسری جانب کبھی کبھی معاشرتی و سماجی انحطاط کا باعث بھی بنتی دکھائی دیتی ہیں۔

پنجاب کی سرزمین اپنی تہذیب، ثقافت اور رسم و رواج کے حوالے سے بھی اپنی ایک الگ پہچان اور مقام رکھتی ہے۔ یہاں کے رسم و رواج اور رشتہ داریوں کو نبھانے کا ایک منفرد ہی انداز ہے۔ ذات برادریوں میں بٹے ہوئے پنجاب کے لوگ اگرچہ اپنی اپنی برادری کے مطابق ان رسم و رواجوں کو نبھاتے ہیں لیکن باوجود اس کے ہر رشتے دار پر اپنے دوسرے رشتہ داروں کے کچھ حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں۔ جن سے کسی بھی صورت انکار ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ روزمرہ زندگی کے معاملات جس میں بچے کی پیدائش سے لے کر مرنے تک کی رسومات اور طور طریقوں کو خوب نبھایا جاتا ہے۔ کسی کے ہاں بچے کی پیدائش پر ماں بننے والی عورت کے لیے گھر کی بڑی بوڑھیاں اُسے خاص نصیحتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ رسمیں بھی ادا کرتی ہیں جنہیں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے بچے کا پہلا دانت نکلتے وقت بھی کچھ رسمیں نبھائی جاتی ہیں اور ننھیال اور ددھیال میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ بچے کی پیدائش کے علاوہ جب کوئی شخص قریب المرگ ہو یا وفات پا جائے تو بھی اس دکھ کے موقع پر مرنے والے کے غسل سے لے کر اسکی تدفین تک کے مراحل کو مذہبی انداز میں نہ صرف ادا کیا جاتا ہے بلکہ معاشرے میں اپنی عزت و ناموس کا بھرم رکھتے ہوئے رسم قل، دسویں اور چہلم کے روز ایصال ثواب کرتے ہوئے کھانوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ کھانے فوت شدگان کے عزیز و اقارب کی جانب سے بطور ہمدردی بنائے جاتے ہیں، اسطرح سے مرحوم کے پسماندگان کی مالی امداد بھی ہو جاتی ہے، لہٰذا اس رسم کو کسی حد تک سماجی و اخلاقی حوالے سے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی رسموں کے علاوہ زندگی کو آگے بڑھانے والا ایک اہم موقع شادی کا ہوتا ہے، پنجاب میں شادی کی رسم خوب جوش و خروش سے منائی جاتی ہے۔ لڑکے لڑکی کی منگنی سے لے کر لڑکی کی رخصتی اور سسرال میں آنے تک خوب رسمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

دولہا دلہن کے ماں باپ اور عزیز و اقارب کی طرف اس اہم موقع پر ادا کی جانے والی رسمیں جہاں اُن کی خوشی اور ذمہ داری کو ادا کرنے کی علامت ہوتی ہیں وہیں پنجاب کی ثقافت اور رسم و رواج کی عکاسی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ پنجاب کے لوگ زندگی میں پیش آنے والے ہر طرح کے حالات کو زندہ اور خوش دلی سے نبھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ لڑکی کو جہیز دینے سے لے کر دولہے والوں یعنی بارات کی خاطر تواضع کرنے تک ہر موقع پر اپنی بیٹی کی عزت کی خاطر تمام رسموں کو نبھایا جاتا ہے، لیکن بعض اوقات غریب والدین ان رسموں و رواجوں کو نبھاتے نبھاتے قرض کے بوجھ تلے ایسے دب جاتے ہیں کہ جن سے باہر آنے میں ان کی ماندہ زندگی گزر جاتی ہے۔ ایک طرف اگر یہ رسمیں خوشی و تفریح کا باعث بنتی ہیں تو دوسری طرف غریب والدین کو تکلیف سے دوچار بھی کرتی ہیں۔ پنجاب کی ثقافت اور کلچر کو چار چاند لگانے میں یہاں کے زندہ دلان لوگوں کا میلے، ٹھیلے اور تہواروں کے مواقع پر جوش و جذبہ دیدنی ہوتا ہے۔ پنجاب کے ہر ضلع اور گاؤں میں میلے ٹھیلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں شرکت کے لئے دور دراز سے بلا تفریق رنگ و نسل اور ذات پات کے لوگ آتے ہیں۔ ہر عمر کے لوگ بچے ہوں یا بوڑھے، مرد ہو یا عورتیں غریب ہو یا امیر سبھی میلوں اور تہواروں کے انتہائی دلدادہ ہوتے ہیں۔ میلے عام طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ میلوں کا اہتمام بزرگان دین کے عرس کے موقع پر خصوصی طور پر کیا جاتا ہے اور کچھ اپنی تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں۔ پنجاب کی دھرتی کو صوفیاء کرام اور ولیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے اللہ کے یہ نیک درویش صفت بندے اسلام کی تبلیغ میں پیش پیش تھے۔ اس خطہ ارض کو اسلام کی روشنی سے منور کرنے میں ان کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ اس لحاظ سے پنجاب کو باقی صوبوں کی نسبت ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیوں کہ یہاں بزرگان دین کی آخری آرام گاہیں بھی موجود ہیں۔ پنجاب کی مادری زبان پنجابی کے سبھی کلاسیکی صوفی شعرا بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے لے کر خواجہ غلام فریدؒ اور میاں محمد بخشؒ تک سب اس دھرتی میں اپنا بسیرا رکھتے ہیں۔ یہ اس دھرتی کی خوش قسمتی ہے جس نے اس خطے کو بہت سے فیوض اور برکات سے آراستہ کیا ہوا ہے۔ اس طرح سے جہاں پنجاب کے میلوں میں مذہبی رنگ اور بزرگان دین کے ساتھ عقیدت و احترام کا جذبہ دکھائی دیتا ہے وہیں دوسری طرف پنجاب کے کلچر کو مدنظر رکھتے ہوئے طاقتور جسم کے مالک جوان کشتی کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سرکس، نیزہ بازی، گھڑ سواری، کے مقابلے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بچوں کے لیے کھلونوں کی دکانیں اور جھولوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ کھانوں کے شوقین پنجابیوں کے لیے خاص طور پر رنگارنگ دیسی کھانوں کے سٹال بھی لگائے جاتے ہیں۔ مرد اور خواتین کی ضروریات زندگی سے متعلق دوکانیں بھی سجائی جاتی ہیں جہاں سے وہ اپنی اپنی دلچسپی اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے چیزیں خریدتے ہیں۔ میلے ہوں یا تہوار پنجاب

کے باسی ان خوشی کے مواقع پر خوب سجتے سنورتے اور عمدہ کپڑے پہن کر جہاں راحت اور دلی آسودگی حاصل کرتے ہیں وہیں اچھا دکھنا اور خوش لباسی بھی پنجابیوں کی ثقافت کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ پنجاب کی عورتیں بہت محنتی ہوتی ہیں، روزمرہ زندگی میں وہ بہت زیادہ بن سنور کر نہیں رہتی ہیں لیکن خوشی کے ہر موقع پر اچھے لباس کے ساتھ زیور کا خوب اہتمام کرتی ہیں۔ مہندی لگانا، چوڑیاں پہننا، زیور پہن کر سجنا سنورنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ شلوار قمیض، لاچا، کُرتا اور تہمبند سر پر اونچا شملہ، پگڑی پنجاب کی ثقافت کا واضح اظہار کرتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی بھی پنجابی ثقافت کو دوسرے صوبوں سے نمایاں کرتی ہے۔ زندہ دل والوں کا پنجاب کھانے پینے کے لحاظ سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ گھر آئے مہمان کی عزت اور ان کے لیے کھانوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ پنجاب کی مہمان نوازی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ رنگارنگ کھانوں سے مہمانوں کی تواضع اور خوب خاطر مدارت کی جاتی ہے جو یہاں کے لوگوں کے خلوص اور محبت کی ضامن بھی ہے۔

خوشی کا موقع ہو یا غمی کا پنجاب کے لوگ ہر دو طرح کے حالات میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا خوب جانتے ہیں۔ مذہبی رسم و رواج کی ادائیگی اگرچہ اپنے اپنے مسلک اور عقیدے کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ خوشی اور غمی کے رسم و رواج بھی اپنی ذات برادریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ادا کیے جاتے ہیں لیکن بلا تفریق ذات پات، رنگ نسل، عقیدے اور مذہب کے لوگوں کے دلی جذبات کو لوک گیتوں کے روپ میں نہایت سادگی اور جذبوں کی سچائی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ لوک گیت اصل میں یہاں بسنے والوں کے دلی جذبات، خواہشات اور تمناؤں کی عکاسی کرتے ہیں، سیدھے سادھے لفظوں کا روپ دھارنے والے گیت، پنجاب کی سیاسی، تاریخی، سماجی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور رومانوی رنگارنگی کے ترجمان بھی ہوتے ہیں۔ دکھ اور سکھ زندگی کے لازم و ملزوم عناصر ہیں جن سے زندگی کی رونق اور گہما گہمی وابستہ ہے۔ ان ہر دو پہلوؤں سے وابستہ لوگوں کے یہ سیدھے سادے بناریاکاری و بناوٹ سے مزین گیت دلوں سے نکلتے دلوں پر اثر کر جانے والے ہوتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہو یا غمی کا، وصل ہو یا فراق کامیابی ہو یا ناکامی، پیدائش ہو یا موت، شادی ہو یا جدائی غرض زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس سے متعلق لوک گیتوں مین ذکر نہ کیا جا سکتا ہو۔ ایک ماں کے اپنی گود میں آنے والی اولاد کے لیے جذبوں سے بھرے الفاظ لوری کی صورت میں سنائی دیتے ہیں تو کبھی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی محبت لڑکپن کے گیت تھال اور ککلی (لوک ناچ) کے بولوں میں موجود بچیوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جوانی کی عمر میں پہنچنے پر ''ماہیے''''ڈھولے'' کے بول جوان دلوں کے مچلتے جذبوں کی نشاندہی کرتے ہیں تو کبھی شادی بیاہ کے موقع پر ''بولی'' اور ''گدا'' جہاں خوشی کا اظہار کرنے کے لیے سننے اور

دیکھنے کو ملتا ہے وہیں معاشرے کے رویوں پر ان کے ذریعے طنز کے نشتر بھی چلائے جاتے ہیں۔ یہ گیت نہصرف پنجابیوں کے دلوں کی آواز ہوتے ہیں بلکہ ان میں پورے پنجاب کی تہذیب اور ثقافت بھی جھلکتی ہے۔

پنجاب کی تاریخ کو اگر کوئی جاننا چاہتا ہو تو وہ ان لوک گیتوں میں چھپے تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر بآسانی پڑھ سکتا ہے۔ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے امین یہ لوک گیت ہر لحاظ سے ایک گراں قدر سرمایہ ہے جس میں اس خطے کے طرز بود وباش، رہن سہن، مذہب و ملت، عقیدے و ایمان، رومان، سیاست، اخلاقیات اور تہذیب کے سبھی رنگ موجود ہیں۔ لوک ادب کسی بھی معاشرے کی تاریخ رقم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے چنانچہ لوک گیت ہوں یا لوک ناچ، لوک کھیلیں ہوں یا لوک تہوار، ہر لحاظ سے پنجاب کی ثقافت اور تہذیب کے نمائندہ یہ سبھی رنگ اپنے اپنے دائرہ کار میں اس خطہ ارض کو زرخیز کرنے میں اپنا ہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ پنجاب چوں کہ صحت مند، طاقتور، چست اور دلیر لوگوں کی سرزمین کے طور سے بھی اپنی پہچان رکھتا ہے اس لیے یہاں کے لوگ جہاں خوشی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وہیں اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے دلچسپ مشاغل میں بھی بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ پنجاب کے گاؤں میں بالخصوص کھیلی جانے والی کھیلیں لوک کھیلوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ چھپن چھپائی، کوکلا چھپاکی، لُکن میٹی، حق پچا، باندر کلا، یسو پنجو، اُکنی مکنی، ککلی، پنج گٹیڑا، سٹاپو، پٹھو گرم، کوڈی، آکاباکا، ٹلوا، باراں ٹہنی، بانٹے، اٹ کھڑکا، آلو ٹاپو، اڈی چھڑپا، تھال، گِدھا، گجی چارا، حبیسی کئی اور لوک کھیلیں جہاں پنجاب کے گبھرو جوانوں اور الہڑ مٹیاروں کی جسمانی صحت کے لئے خوراک کا کام دیتی ہیں وہیں پر ان کے بولوں میں چھپے جذبے ان کی سادگی اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ان لوک کھیلوں کے ذریعے پنجاب کی ثقافت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں بچیوں کے یہ کھیل بڑوں کی دلچسپی کا باعث بھی بنتے ہیں جنھیں کبھی علیحدہٰ سے اور کبھی مل جل کر بھی کھیلا جاتا ہے۔ یوں انفرادی سطح سے گروہی اور اجتماعی شعور کی بیداری بھی ممکن ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ کھیلوں میں ہار جیت کے باعث قوت و برداشت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک دوسرے کے تعاون سے آگے بڑھنے کی لگن بھی دل میں کروٹ لیتی ہے۔ پنجاب کی سرزمین تہذیبی اور ثقافتی ہر دولحاظ سے دنیا کی دوسری تہذیبوں سے نہ صرف ممتاز ہے بلکہ اپنی قدامت کی بنا پر بہت اہمیت کی حامل بھی ہے۔ یہاں کے تہذیبی رنگوں میں لوک ادب، لوک ہنر، رسم و رواج، میلے ٹھیلے، لین دین، لوگوں کے عقائد و توہمات، لوک تہوار، لوک ناٹک، لوک گیت، لوک کھیل، غرض کہ زندگی کا کوئی بھی ایسا پہلو نہیں جو اپنی پوری رعنائی، رنگارنگی اور سچائی و سادگی سے دکھائی نہ دیتا ہو۔ یہ سب پہلو یکجا ہو کر پنجاب کی تہذیب اور ثقافت کو دنیا کی ثقافتوں میں ممتاز مقام دلوا رہے ہیں۔ پنجاب کی ثقافت کا یہ حسین امتزاج یہاں کے لوگوں کے مزاج، رویئے اور عقیدے کا عکاس بھی

ہے اور یہاں بسنے والوں کی زندہ دلی سے مبر احیات کا سامان بھی ہے۔ لوک ادب کے بارے میں ہم اگلے یونٹ میں تفصیل سے پڑھیں گے، اس یونٹ میں ہم پنجاب کے روایتی عُرس و میلے، کھیل اور رقص کے بارے میں جانیں گے۔

2.5 عُرس و میلے:

پنجاب میں مختلف اولیاء کرام کے عرس منائے جاتے ہیں جو صدیوں سے عوامی عقیدت کا مرکز ہیں۔ یہ عرس عام طور پر اسلامی صوفیاء، بزرگوں اور عالموں کی وفات کی برسی کے طور پر منائے جاتے ہیں اور ان کے مزاروں پر ہزاروں لوگ حاضری دیتے ہیں۔ عُرس کے مواقع پر میلے لگائے جاتے ہیں۔ ہر گاؤں میں مختلف بزرگان دین کے عُرس منعقد کیے جاتے ہیں اور میلے لگائے جاتے ہیں۔ پنجاب کے مشہور عرس میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ (لاہور)، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ (پاکپتن)، حضرت شاہ رکن عالمؒ (ملتان)، حضرت سلطان باہوؒ (جھنگ) اور حضرت بلھے شاہؒ (قصور) شامل ہیں۔ یہ عرس سماجی اور مذہبی روایات کے ساتھ ساتھ ثقافتی تقریبات کا حصہ بھی ہوتے ہیں جہاں قوالیاں، محافلِ سماع، اور میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ ان عرسوں میں عوام دور دراز سے آتے ہیں، نذرانے پیش کرتے ہیں، اور دعا کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ یہ تقریبات نہ صرف روحانی تسکین کا ذریعہ ہوتی ہیں بلکہ صوفی ازم کی تعلیمات کے فروغ کا بھی ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ:

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کا عرس ہر سال لاہور میں اُن کے مزار پر منایا جاتا ہے۔ آپ کا اصل نام علی بن عثمان ہجویری تھا اور آپ کو "داتا گنج بخش" کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ آپ کا مزار لاہور میں واقع ہے اور یہ روحانی مرکز صدیوں سے لوگوں کے لیے باعثِ عقیدت و احترام ہے۔ عرس حضرت داتا گنج بخشؒ ہر سال اسلامی مہینے صفر کی 18 تا 20 تاریخ کو منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ تین روزہ تقریب ملک بھر سے لاکھوں عقیدت مندوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ عرس کے دوران مزار کو خاص طور پر سجایا جاتا ہے، اور مختلف مذہبی و روحانی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ پورے ملک سے لوگ یہاں منتیں مانگنے آتے ہیں اور پھر منت پوری ہونے پر نذرانے چڑھانے آتے ہیں خصوصاً عُرس کے دنوں میں نذرانے پیش کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ:

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا عرس پاکپتن، پنجاب میں ان کے مزار پر ہر سال عقیدت اور جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ بابا فریدؒ برصغیر کے مشہور صوفی بزرگ اور سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کو "گنج شکر" کے لقب سے نوازا گیا، جو آپ کی کرامات اور روحانی فیض کی

نشانی ہے۔ بابا فریدؒ کا عرس ہر سال اسلامی مہینے محرم کی 25 تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور یہ تقریبات پانچ روز تک جاری رہتی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں زائرین پاکپتن آتے ہیں تاکہ بابا فریدؒ کے مزار پر حاضری دے سکیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کریں۔ عرس کی تقریبات میں مختلف روحانی اور مذہبی رسومات شامل ہوتی ہیں۔ مزار کے غسل کی رسم سب سے اہم ہوتی ہے، جہاں مزار کو عرق گلاب اور پانی سے دھویا جاتا ہے۔ اس کے بعد چادر پوشی کی رسم ہوتی ہے، جس میں ملک کے مختلف حصوں سے لوگ اور اہم شخصیات حصہ لیتے ہیں۔ عرس کے دوران مزار کے اندر اور باہر قرآن خوانی، نعت خوانی اور قوالی کی محافل منعقد کی جاتی ہیں۔ قوالیاں حضرت بابا فریدؒ کی تعلیمات اور صوفیانہ شاعری پر مبنی ہوتی ہیں، جو لوگوں کے دلوں میں روحانی سکون اور محبت بھر دیتی ہیں۔ محافل سماع بھی عرس کا ایک اہم حصہ ہیں، جہاں صوفی قوال اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور لوگوں کو حضرت بابا فریدؒ کے پیغام محبت و امن سے آگاہ کرتے ہیں۔

حضرت بابا فریدؒ کی زندگی علم، تقویٰ اور روحانیت کا بہترین نمونہ تھی۔ آپ نے لوگوں کو اللہ کی محبت، صبر، شکر اور خدمت خلق کا درس دیا۔ آپ کی تعلیمات میں خاص طور پر انسانیت کی خدمت، اخلاص، اور عاجزی پر زور دیا گیا ہے۔ بابا فریدؒ کی شاعری، جو پنجابی زبان میں ہے، آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے اور روحانی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ عرس بابا فریدؒ کے موقع پر زائرین نہ صرف روحانی فیض حاصل کرتے ہیں بلکہ بابا فریدؒ کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ عرس مذہبی ہم آہنگی اور صوفی ازم کے پیغام کا عملی مظہر ہوتا ہے۔

حضرت شاہ رکن عالمؒ:

حضرت شاہ رکن عالمؒ کا عرس ہر سال ملتان میں ان کے مزار پر منعقد کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ رکن الدین عالمؒ برصغیر کے عظیم صوفی بزرگ اور سلسلہ سہروردیہ کے نمایاں پیشوا تھے۔ آپ کا مزار ملتان کے قدیم قلعہ پر واقع ہے، اور یہ روحانی، تاریخی اور ثقافتی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت شاہ رکن عالمؒ کا عرس ہر سال اسلامی مہینے جمادی الثانی کی 3 سے 5 تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ تین روزہ عرس کی تقریبات میں ملک بھر سے ہزاروں زائرین شرکت کرتے ہیں اور مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ عرس کا آغاز مزار کی غسل کی رسم سے ہوتا ہے، جس کے بعد چادر پوشی اور گلاب کی پتیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ عرس کے دوران مزار پر مختلف مذہبی اور روحانی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ قرآن خوانی، نعت خوانی، اور خصوصی دعاؤں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ قوالی کی محافل بھی عرس کی تقریبات کا ایک اہم حصہ ہیں، جن میں صوفیانہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عرس و میلہ محبت، اخوت اور امن و آشتی کا پیغام دیتا ہے اور عوام الناس کو حضرت شاہ رکن عالمؒ کی تعلیمات سے روشناس کراتا ہے۔

شاہ حسینؒ/میلہ چراغاں:

شاہ حسینؒ کا عرس ہر سال لاہور میں ان کے مزار پر منایا جاتا ہے، جو کہ مقامی طور پر "مادھو لال حسین" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ حضرت شاہ حسینؒ ایک معروف صوفی شاعر تھے اور پنجابی زبان میں آپ کی شاعری آج بھیمقبول عام ہے۔ آپ سلسلہ قادریہ کے صوفی بزرگ تھے اور صوفی ازم میں "ملنگ" یا "فقر" کی روایت کے ساتھ منسلک تھے۔ حضرت شاہ حسینؒ کا عرس موسم بہار میں مارچ کے آخری ہفتہ کے دن سے شروعہوتا ہے اور تین دن جاری رہتا ہے۔ لاہور میں واقع باغبانپورہ کے علاقے میں، جہاں حضرت شاہ حسینؒ کا مزار موجود ہے، وہاں یہ عرس "مَیلہ چراغاں" (چراغوں کا میلہ) کے نام سے بھیجانا جاتا ہے۔ عرس کی تقریبات میں ہزاروں زائرین مزار پر حاضری دیتے ہیں اور آپ کی درگاہ پر چراغ جلاتے ہیں، جو کہ روشنی اور عقیدت کی علامت ہے۔ عرس کے دوران مزار کو خاص طور پر سجایا جاتا ہے۔ یہ میلہ لاہور کے قدیم ثقافتی میلوں میں شمار ہوتا ہے اور عوام کی بڑی تعداد اس میں شرکت کرتی ہے۔ میلہ چراغاں میں چراغاں کی رسم کو خاص اہمیت حاصل ہے، جس میں مزار کے اطراف اور پورے علاقے کو چراغوں سے منور کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ حسینؒ کا عرس لاہور کی صوفی روایت اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے، جو لوگوں کو روحانی طور پر جوڑتا ہے اور حضرت شاہ حسینؒ کی محبت و امن کی تعلیمات کو فروغ دیتا ہے۔

سلطان باہوؒ:

سلطان باہوؒ کا عرس ہر سال پنجاب کے ضلع جھنگ، تحصیل شورکوٹ (موضع اور یونین کونسل بھی حضرت سلطان باہوؒ کے نام سے منسوب ہے) میں ان کی درگاہ پر بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ عرس کا یہ موقع سلطان باہوؒ کی روحانی تعلیمات، ان کے کلام اور صوفیانہ فلسفے کی ترویج کے لیے اہم ہوتا ہے۔ سلطان باہوؒ کا عرس ہر سال جمادالثانی کی پہلی جمعرات کو منایا جاتا ہے۔ عرس کا مرکزی مقام سلطان باہوؒ کا مزار ہے، جو کہ شورکوٹ میں واقع ہے۔ یہاں ہزاروں زائرین ہر سال آتے ہیں تاکہ وہ آپ کی روحانی فضاؤں میں بیٹھ کر اللہ کی رحمت حاصل کریں۔ عرس کے موقع پر مختلف تقریبات منعقد کی جاتی ہیں، زائرین اور عقیدت مندوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جہاں اللہ کے ذکر اور درود و سلام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ معروف قوال اور نعت خواں اس موقع پر نعتیں اور قوالیاں پیش کرتے ہیں، جو سلطان باہوؒ کی محبت اور روحانیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ مختلف علمائے کرام اور صوفی شعراء اپنے کلام اور تقاریر کے ذریعے سلطان باہوؒ کی تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ روحانی رہنما اور صوفیائے کرام درس بھی دیتے ہیں، لوگ سوالات کرتے ہیں اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عرس کے دنوں میں مزار پر زائرین کی بڑی تعداد آتی ہے۔ لوگ دور دراز علاقوں سے آتے ہیں، اور یہاں

روحانی سکون اور رحمت کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ عرس کے دوران زائرین کو کھانا، پانی، اور دیگر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ سلطان باہوؒ کا عرس روحانی ارتقاء، محبت اور انسانیت کی خدمت کا پیغام دیتا ہے۔ یہ موقع نہ صرف روحانی ترقی کے لیے ہے بلکہ معاشرتی ہم آہنگی اور بھائی چارے کو فروغ دینے کا بھی باعث بنتا ہے۔ سلطان باہوؒ کی تعلیمات اور ان کا کلام آج بھی لوگوں کی زندگیوں میں روشنی پھیلانے کا ذریعہ ہیں، اور عرس کا یہ موقع اس روحانی ورثے کی تجدید کا موقع فراہم کرتا ہے۔

بابا بلھے شاہؒ:

بابا بلھے شاہؒ، جو کہ ایک مشہور صوفی شاعر اور فلسفی تھے ان کا عرس ہر سال بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ آپ کا مزار مبارک " قصور" ریلوے روڈ پر زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ آپ کا عرس ہر سال شمسی ماہ بھادوں میں جو چاند نظر آئے اس کی 12، 11، 13 تاریخ کو یعنی اگست کی 26، 27، 28 تاریخ کو قصور میں منعقد ہوتا ہے۔ عرس کے موقع پر مختلف تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے، جن میں محفل ذکر، نعت خوانی اور قوالی شامل ہیں۔ زائرین کا ایک بڑا ہجوم یہاں جمع ہوتا ہے تاکہ وہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہو سکیں اور بابا بلھے شاہؒ کی محبت اور روحانیت کا تجربہ حاصل کر سکیں۔ معروف قوال اور نعت خواں اس موقع پر اپنی آواز کا جادو جگاتے ہیں، جس سے محفل میں روحانی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ زائرین نہ صرف بابا بلھے شاہؒ کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ آپ کی تعلیمات کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ عرس کے دوران، علمائے کرام اور صوفی بزرگ زائرین کو بابا بلھے شاہؒ کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔ یہ روحانی درس و تدریس لوگوں کے دلوں میں محبت، امن، اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ، زائرین کو کھانے، پینے اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے لیے انتظامات کیے جاتے ہیں، تاکہ ان کا سفر روحانی تجربات سے بھرپور ہو سکے۔ بابا بلھے شاہؒ کا عرس نہ صرف روحانی ارتقاء کا موقع ہے بلکہ یہ محبت، بھائی چارے اور انسانیت کے پیغام کو بھی فروغ دیتا ہے۔ آپ کی شاعری میں انسانی اقدار، اللہ کی محبت، اور دنیا کی فانی نوعیت کا بیان کیا گیا ہے، جو لوگوں کے دلوں کو سکون عطا کرتا ہے۔ ہر سال اس عرس کی رونقوں میں اضافہ ہوتا ہے، اور لوگ اس موقع پر اپنی روحانی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جو کہ بابا بلھے شاہؒ کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ یہ عرس ہر سال لوگوں کو اپنے عقائد اور روحانی سفر کی تجدید کا موقع فراہم کرتا ہے۔ زائرین نہ صرف روحانی سکون حاصل کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کا پیغام بھی بانٹتے ہیں۔ بابا بلھے شاہؒ کا عرس ایک روحانی سفر کی مانند ہے، جو انسان کو اللہ کی جانب لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

2.6 پنجاب کے روایتی کھیل:

پنجاب کے روایتی کھیل، ثقافت کا اہم حصہ ہیں اور ان میں مختلف قسم کے کھیل شامل ہیں۔ یہاں کچھ اہم کھیلوں کی تفصیل دی گئی ہے:

کبڈی

کبڈی ایک مقبول روایتی کھیل ہے جو زیادہ تر کھلی جگہوں پر کھیلا جاتا ہے۔ یہ دو ٹیموں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ ہر ٹیم کا مقصد دوسری ٹیم کے کھلاڑیوں کو چھونا اور پھر بغیر سانس لیے اپنی طرف واپس آنا ہوتا ہے۔ اس کھیل میں طاقت، اسٹریٹجی اور تیز رفتاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

گُلی ڈنڈا

گُلی ڈنڈا ایک روایتی کھیل ہے جس میں ایک چھڑی (ڈنڈا) اور ایکگُلی (چھوٹی گول شکل) استعمال ہوتی ہے۔ کھلاڑیگُلی کو ڈنڈے سے مار کر دور پھینکتے ہیں، اور دوسرا کھلاڑی اس گُلی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کھیل خاص طور پر دیہی علاقوں میں بچوں اور نوجوانوں کے درمیان مقبول ہے۔

پکڑن پکڑائی

یہ کھیل زیادہ تر بچوں میں کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل میں ایک کھلاڑی "چور" ہوتا ہے اور اس کا مقصد دوسروں کو پکڑنا ہوتا ہے۔ یہ کھیل کھیلنے کے لئے تیز دوڑ، چالاکی اور ٹیم ورک کی مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مالا

یہ ایک اور روایتی کھیل ہے جس میں کھلاڑیوں کی دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ ہر ٹیم کو ایک مالا (چوڑا رسی) سے جھکنا ہوتا ہے۔ ٹیمیں اپنی مہارتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو چالاکی سے ہرانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ہوائی ڈنڈا

ہوائی ڈنڈا ایک روایتی کھیل ہے جس میں کھلاڑی چھڑی کو ہوا میں پھینکتے ہیں اور اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کھیل کھیلنے کے لئے تیز رفتاری اور مضبوط جسمانی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

چوگا

پنجاب کے دیہی علاقوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل عموماً میلے، شادیوں اور دیگر تہواروں پر منعقد ہوتا ہے۔ چُوگا کا مقصد کھلاڑیوں کی جسمانی مہارتوں اور فنون کو دکھانا ہوتا ہے، اور اس میں مختلف قسم کے رقص، چالیں اور کھیل شامل ہوتے ہیں۔ چُوگا ایک روایتی کھیل ہے جو نہ صرف تفریحی ہے بلکہ اس کے ذریعے

نوجوانوں کو ثقافتی ورثے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس کھیل میں نوجوان اپنی مہارتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں، جس سے یہ کھیل مزید دلچسپ ہو جاتا ہے۔ یہ کھیل نہ صرف خوشی کا ذریعہ ہے بلکہ معاشرتی رابطے کو بھی فروغ دیتا ہے

کھیڈا

یہ کھیل خاص طور پر دیہی علاقوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان مقبول ہے۔ اس میں ایک قسم کی دوڑ اور ریس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پنجاب کے یہ روایتی کھیل نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کے ذریعے ثقافتی ورثے کو بھی زندہ رکھا جاتا ہے۔

2.7 پنجاب کے لوک رقص:

حُسنِ عشق اور رنگ و بو کی سرزمین پنجاب کے لوگ زندہ دل ہوتے ہیں اور اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے روایتی رقص کرتے ہیں۔ جن میں چند اہم یہ ہیں:

بھنگڑا:

بھنگڑا پنجاب کے مشہور اور روایتی لوک رقصوں میں سے ایک ہے، جو خاص طور پر خوشی، خوشحالی اور جشن کے مواقع پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی جڑیں زرعی ثقافت میں ہیں اور یہ فصل کی کٹائی کے موسم میں خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ بھنگڑا اب صرف ایک مقامی ناچ نہیں بلکہ یہ دنیا بھر میں پنجاب کی ثقافت کی شناخت بن چکا ہے۔ بھنگڑے کی تاریخ قدیم زمانے تک جاتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر جوان مردوں کا ناچ ہے اور پنجاب کے کسانوں کی خوشیوں کا اظہار ہے، جب وہ فصلوں کی کامیاب کٹائی کے بعد جشن مناتے ہیں۔ بھنگڑے کی موسیقی میں عام طور پر ڈھول، ٹانگے، اور موری جیسے سازوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈھول کی دھمک بھنگڑے کی روح ہے، جو ناچنے والوں کے قدموں کی تیز رفتار کو برقرار رکھتا ہے۔ جدید دور میں، بھنگڑے میں جدید موسیقی بھی شامل کی جارہی ہے، جیسے کہ الیکٹرانک ساز اور مختلف اسٹائلز۔ بھنگڑا طاقتور، چست اور تیز رفتار حرکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں چھلانگیں، گھومنا، اور ہاتھوں کی حرکات شامل ہیں۔ بھنگڑا کرنے والے عام طور پر روایتی لباس پہنتے ہیں، جیسے کہ پنجابی پگڑی (Turban) اور لُنگی، جو چمکدار رنگوں میں ہوتے ہیں۔ بھنگڑا اکثر ایک دائرے میں کیا جاتا ہے، جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر ناچتے ہیں۔ بھنگڑا اکثر مختلف تہواروں اور تقریبات پر کیا جاتا ہے، جیسے بیساکھی، جو فصل کی کٹائی کا جشن منانے کے لیے خاص طور پر کیا جاتا ہے، اور شادیوں میں بھییہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، جہاں دلہا اور دلہن کے دوست و احباب مل کر ناچتے ہیں۔ مختلف ثقافتی پروگراموں اور میلے میں بھی بھنگڑا پیش کیا جاتا ہے، جو اس کی مقبولیت کو بڑھاتا ہے۔ بھنگڑا نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہے بلکہ

یہ پنجاب کی ثقافت، روایات اور معاشرتی تعلقات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے ذریعے لوگ خوشی، محبت، اور اتحاد کا پیغام پھیلاتے ہیں۔ بھنگڑا ایک بھرپور ثقافتی ورثہ ہے جو نہ صرف پنجاب بلکہ دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی تیز رفتار، خوشیوں سے بھرپور حرکات اور دلکش موسیقی لوگوں کو جڑنے کا موقع فراہم کرتی ہیں، اور یہ پنجاب کی ثقافتی شناخت کا ایک اہم حصہ ہے۔

لُڈی:

لُڈی پنجاب کا ایک روایتی لوک رقص ہے جو خاص طور پر پنجاب کی ثقافتی تقریبات اور خوشیوں کے موقع پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ رقص عام طور پر شادی، میلے، یا کسی دوسری خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ لُڈی کا بنیادی مقصد خوشی کا اظہار کرنا اور محفل کی رونق بڑھانا ہوتا ہے۔ اس رقص میں عام طور پر مرد اور خواتین دونوں شریک ہوتے ہیں، اور اس کا انداز انتہائی دل کش اور مسرت بھرا ہوتا ہے۔ لُڈی کا آغاز اکثر ایک خاص ساز، جیسے ڈھول، کی تال پر ہوتا ہے۔ ڈھول کی دھنیں لوگوں کو جھومنے اور ناچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ رقص کے دوران، لوگ اپنے ہاتھوں کو اوپر نیچے کرتے ہیں اور چکروں میں گھومتے ہیں۔ یہ رقص انتہائی توانائی بھرا اور تیز ہوتا ہے، اور اس میں مختلف اشکال اور حرکتیں شامل ہوتی ہیں، جیسے کہ چکروں کا مارنا، جھومنا، اور ہاتھوں کی تالی بجانا۔ لُڈی کے دوران رقص کرنے والے عموماً روایتی لباس پہنتے ہیں، جیسے کہ کرتا اور پاجامہ مردوں کے لیے، جبکہ خواتین عام طور پر شال یا پھلوارے کے ساتھ سجتی ہیں۔ اس رقص میں مخصوص اشعار اور گانے بھی شامل ہوتے ہیں جو ثقافتی ورثے کی عکاسی کرتے ہیں۔ لُڈی پنجاب کی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے اور یہ نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہے بلکہ لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا بھی کام کرتا ہے۔ یہ رقص جدید دور میں بھی مقبول ہے، اور مختلف ثقافتی پروگراموں، فیسٹیولز اور تقریبوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

گِدا:

گِدا ایک روایتی پنجابی رقص ہے جو خاص طور پر پنجاب کے علاقے میں معروف ہے۔ یہ رقص عموماً شادیوں، خوشیوں کی تقریبات اور مختلف تہواروں پر پیش کیا جاتا ہے۔ گِدا کی خاص بات یہ ہے کہ یہ خالصتاً خواتین کا رقص ہے، جو ایک مخصوص دُھن اور تال پر کیا جاتا ہے۔ گِدا کا آغاز عموماً دائرے کی شکل میں ہوتا ہے، جہاں خواتین ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے گرد گھومتی ہیں۔ اس رقص کی خصوصیات میں تیز و دلکش حرکات، جھومنے اور چکر لگانے کے انداز شامل ہیں۔ خواتین روایتی لباس پہنتی ہیں، جو عموماً چمکدار رنگوں اور خوبصورت زیورات سے سجی ہوتی ہیں، جو اس رقص کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ گِدا کے رقص میں مختلف قسم کے گانے شامل ہوتے ہیں، جو لوک ثقافت اور روزمرہ کی زندگی کی کہانیاں بیان کرتے

ہیں۔ یہ گانے عموماً خوشی، مسرت، محبت اور زندگی کی خوشیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ گِدا ناچ کے دوران، خواتین اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر محفل کو رونق بخشتی ہیں۔ یہ رقص صرف تفریح کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ پنجابی ثقافت کی جڑوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ گِدا کی مدد سے خواتین اپنی ثقافت کو زندہ رکھتے ہوئے اپنی روایات کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسی سرگرمی ہے جو نہ صرف جسمانی صحت کے لیے مفید ہے بلکہ خواتین کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ان کے درمیان اتحاد کو فروغ دینے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

جھُمر:

جھُمر پنجابی لوک رقصوں میں سے ایک خوبصورت اور مشہور رقص ہے جو خاص طور پر پاکستان کے جنوبی پنجاب اور سندھ کے کچھ حصوں میں مقبول ہے۔ یہ رقص عام طور پر خوشی کے مواقع، شادیوں اور تہواروں پر پیش کیا جاتا ہے۔ جھُمر رقص کی خصوصیات میں تال کے ساتھ ہلکی ہلکی حرکات، گھومنا، اور بازوؤں کو مخصوص انداز میں گھمانا شامل ہیں۔ اس رقص میں شرکت کرنے والے اکثر گروپس کی صورت میں دائرے کی شکل میں کھڑے ہو کر مخصوص موسیقی اور ڈھول کی تھاپ پر حرکت کرتے ہیں۔ جھُمر رقص عموماً مردوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، اور اسے کرنے والے مخصوص لباس، جیسے کہ دھوتی اور کرتا، پہنتے ہیں۔ جھُمر کی موسیقی بھی لوک سازوں جیسے کہ ڈھول اور شہنائی کے ساتھ ہوتی ہے، جس سے اس کی خوبصورتی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ککلی:

ککلی پنجابی لوک رقصوں میں سے ایک خوشگوار اور دلکش رقص ہے، جو عموماً لڑکیوں اور خواتین کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ رقص خاص طور پر خوشی کے مواقع جیسے شادیوں، تہواروں اور دیگر تقریبات پر کیا جاتا ہے۔ ککلی کی اصل خوبصورتی اس کی اجتماعی نوعیت میں ہے، جہاں لڑکیاں ایک دائرے کی شکل میں کھڑی ہو کر ہاتھوں کو پکڑ کر رقص کرتی ہیں۔ اس رقص کی خاص بات یہ ہے کہ یہ باہمی محبت اور دوستی کا اظہار کرتا ہے۔ ککلی کی خاصیتوں میں چرخا گھمانا بھی شامل ہے۔ رقص کے دوران، لڑکیاں ہاتھوں میں چرخا (پھیرے) گھما کر مختلف حرکات کرتی ہیں، جو کہ رقص کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ حرکات عام طور پر تیز رفتار اور خوشگوار ہوتی ہیں، جو محفل کو مزید رونق بخشتی ہیں۔ اس کے علاوہ، ککلی کے دوران خوشگوار ہنسی مذاق کا ماحول بھی پایا جاتا ہے، جو دیکھنے والوں کو محظوظ کرتا ہے۔ ککلی میں استعمال ہونے والی موسیقی اور گیت اسے مزید رعنائی بخشتے ہیں۔ روایتی پنجابی موسیقی، جیسے کہ ڈھول اور شہنائی، رقص کی تیز اور خوشگوار دھڑکن

فراہم کرتی ہے، جو رقص کرنے والوں کو مزید جوش و خروش دیتی ہے۔ اس کے علاوہ، ککلی کرنے والی لڑکیاں عموماً روایتی پنجابی لباس، جیسے کہ چوڑی دار اور دوپٹہ، پہنتی ہیں، جو رقص کی رونق کو بڑھاتا ہے اور ثقافتی شناخت کا اظہار کرتا ہے۔ ککلی رقص محفل میں خوشی اور ہنسی کا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس کا انداز بہت خوشگوار اور دلکش ہوتا ہے۔ یہ پنجابی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے اور نوجوان نسل میں بھی مقبول ہے۔ ککلی رقص کا مقصد صرف تفریح نہیں، بلکہ ثقافتی روایات کو زندہ رکھنا اور آپس میں محبت اور بھائی چارے کا اظہار کرنا بھی ہے۔ ککلی کے ساتھ کچھ مخصوص لوک گیت بھی گائے جاتے ہیں جیسا کہ

ککلی کلیر دی　　پگ میرے ویر دی

دوپٹہ میرے بھائی دا　　فٹے منہ جوائی دا

ترجمہ:

میں ککلی ڈال رہی ہوں، پگ میرے بھائی کی ہے، دوپٹہ میرے بھائی کا ہے اور داماد کا منہ بے سُرا ہے۔

عموماً یہ گیت پیار، محبت اور بھائی چارے کے جذبے سے لبریز ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سُر اور لے برقرار رکھنے کے لیے بے معنی بول بھی ان کا حصہ بن جاتے ہیں۔

خود آزمائی

1۔ تہذیب و ثقافت کی تعریف کیجیئے اور ان کے مابین فرق بھی واضح کیجیئے۔

2۔ پنجاب کا تہذیبی پس منظر بیان کیجیئے۔

3۔ پنجاب کی تہذیب و ثقافت کے اہم خدوخال بیان کیجیئے۔

4۔ پنجاب میں منائے جانے والے مختلف اولیائے کرام کے عُرس کی تفصیلات درجکیجیئے۔

5۔ پنجاب کے روایتی کھیلوں کا تعارف کروایئے۔

6۔ پنجاب کے مشہور لوک رقص کون سے ہیں اور ان کی خصوصیات کیا ہیں؟

یونٹ نمبر:3

پنجابی لوک ادب

تحریر:ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی:ڈاکٹر عائشہ رحمٰن

فہرست

یونٹ کا تعارف		47
مقاصد		47
3.1	(لوک ادب): مجموعی تعارف	48
3.2	لوک گیت	49
3.2.1	لوری	50
3.2.2	ماہیا	50
3.2.3	ٹپہ	51
3.2.4	جگنی	52
3.2.5	ڈھولا	53
3.2.6	بولیاں	54
3.2.7	چھلا	55
3.2.8	وین	55
3.3	لوک بات (کہانی)	56
3.4	بجھارتیں/اکھان	56
3.5	ضرب الامثال	57
3.6	محاورے مع اردو ترجمہ	62
	خود آزمائی	64

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

لوک ادب (Folk Lore) کسی بھی معاشرے یا قوم کے اجتماعی شعور، روایات، ثقافت، اور روزمرہ کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ ادب تحریری نہیں ہوتا بلکہ زبانی روایات کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ لوک ادب کی مختلف شکلوں میں لوک کہانیاں، گیت، محاورے، کہاوتیں، قصے، اور رسم و رواج شامل ہوتے ہیں۔ اس یونٹ میں ہم پنجابی لوک گیتوں کی مختلف اقسام کے بارے میں سیر حاصل معلومات حاصل کریں گے نیز پنجابی ضرب الامثال (اکھان) محاورات اور بجھارتوں کے بارے میں بھی پڑھیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ لوک ادب کی تعریف اور خصوصیات سے آگاہ ہو سکیں۔

2۔ پنجابی لوک گیتوں کی مختلف اقسام کے بارے میں جان سکیں۔

3۔ اکھان کی تعریف اور مفہوم و معنی مثالوں کے ساتھ واضح کر سکیں۔

4۔ پنجابی محاورہ کے بارے میں سیر حاصل معلومات حاصل کر سکیں۔

پنجابی لوک ادب

3.1 لوک ادب (مجموعی تعارف):

لوک ادب کو عوامی ادب بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ عوام کے جذبات کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔لوک ادب پر عوام کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ اس ادب میں کسی ملک یا خطے کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کے ساتھ ساتھ مسائل حیات بھی پنہاں ہوتے ہیں، لوک ادب میں حکمت و دانائی وافر ملتی ہے، اس کے علاوہ یہ تصنع، بناوٹ اور منافقت و ریاکاری سے پاک ہوتا ہے۔ یہ صدیوں کی پیدوار ہوتا ہے اس کا خالق نامعلوم ہوتا ہے۔ یہ عوام کا مشترکہ ورثہ ہوتا ہے جو صدیوں تک سینہ بہ سینہ چلتا ہوا ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے اور یہ ہر دور کے حالات و واقعات کا امین ہوتا ہے ۔لوک ادب (Folk Lore) عوامی تہذیب، روایات، اور ثقافتی ورثے کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے، جو زبانی یا غیر رسمی طریقوں سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔ یہ ادب عام لوگوں کے خیالات، جذبات، تجربات اور معاشرتی رویوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لوک ادب میں گیت، کہاوتیں، محاورے، پہیلیاں، داستانیں اور لوک کہانیاں شامل ہوتی ہیں۔لوک ادب زبانی طور پر منتقل ہوتا ہے، یعنی اسے لکھا نہیں جاتا بلکہ سنایا اور سنا جاتا ہے البتہ دور جدید میں اس عوامی خزانے کو محفوظ کرنے کے لئے اس کو دائرہ تحریر میں لایا گیا ہے۔

یہ ادب کسی ایک فرد کی تخلیق نہیں ہوتا، بلکہ اس میں پوری قوم یا برادری کا حصہ ہوتا ہے۔لوک ادب عام لوگوں کی زندگیوں اور مسائل کی عکاسی کرتا ہے، اس لیے اس میں سادگی اور فطری رنگ پایا جاتا ہے۔ ہر علاقے، قوم یا برادری کا اپنا منفرد لوک ادب ہوتا ہے، جو اس کی ثقافت، رسم و رواج اور زبان کو ظاہر کرتا ہے۔پنجابی لوک ادب پنجاب کی روایتی ثقافت اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ پنجاب کی زرخیز زمین اور زندہ دل لوگوں کی وجہ سے اس ادب میں زندگی کی رنگینی اور گہرائی نمایاں ہے۔ پنجابی لوک ادب میں زبانی روایتوں کا اہم کردار ہے جنہیں گیتوں، کہانیوں، قصوں، بجھارتوں، اکھان اور محاوروں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لوک ادب میں نثر اور گیت شامل ہیں۔ لوک کہانی اور ضرب الامثال حکمت و دانائی کے بے مثال خزانے ہیں جب کہ لوک گیت سرزمین اور عوام کے ترجمان ہوتے ہیں۔

پنجابی لوک گیت، مثلاً ماہیا، ٹپے، ڈھولا، جگنی، لوری، چھلا، وین اور بولیاں مشہور ہیں، جو کہ روزمرہ کی زندگی کے مسائل، محبت، جدائی، اور سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

3.2 لوک گیت:

یہ وہ عوامی گیت ہوتے ہیں جو عوام سے پھوٹتے ہیں، ان میں عوام کی خواہش، امنگیں، مزاج اور کلچر پنہاں ہوتا ہے۔ ان کا اپنی دھرتی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ پانچ دریاؤں کی دھرتی کے لوک گیت بھی یہاں کی زندگی کے عکاس ہیں۔ یہ گیت پنجابی قوم کی سوچ اور جذبات کے اظہار کا وہ ذریعہ ہیں جو پنجاب کے گاؤں قصبوں شہروں غرض یہ کہ ہر جگہ کے لوگوں نے اپنایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گیت ایک شاعر کی تخلیق نہیں ہوتے بلکہ ساری قوم کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں کسی قوم کی سوچ مزاج اور جذبات کو سمجھنے کے لیے لوک گیتوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ لوک گیتوں کے ذریعے تاریخ کے اوراق بھی سامنے آتے ہیں کہ اس دھرتی پر کون لوگ حکومت کرتے رہے ہیں اور ان کا عہد کیسا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کی سچائیاں بھی ان گیتوں میں پس انداز ہوتی ہیں جو زبان زدِ عام ہو کر سینہ بہ سینہ چلتی رہتی ہیں، ان میں حکمت و دانائی کی باتیں وافر ملتی ہیں۔ یہ گیت ریاکاری منافقت، تصنع و بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ ان گیتوں میں دل موہ لینے والی سادگی و معصومیت ہوتی ہے۔ جذبہ، مشاہدہ اور موسیقیت ان گیتوں کے بنیادی محرکات ہیں۔

پانچ دریاؤں کی سرزمین کو لوک گیتوں کا دیس کہا جاتا ہے تو غلط نہیں ہو گا۔ پنجاب کے لوگوں کی حیات کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہو گا جو ان گیتوں سے عیاں نہ ہو۔ خاص طور پر یہ گیت دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں کھیتوں کھلیانوں، چراگاہوں، مال مویشیوں، کچے گھروں اور ان میں بسنے والوں کی جاندار عکاسی کی گئی ہے۔ لوک گیتوں کی تخلیق گاؤں دیہاتوں میں کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے فطرت کے مناظر ان کو دلکش بناتے ہیں۔ پنجابی دیہاتی زندگی میں بہن بھائی کی محبت، سہیلیوں، سکھیوں کا آپس میں پیار، شادی شدہ لڑکیوں کا میکے کی یاد میں تڑپنا، ہجر و فراق اور عشقیہ راز و نیاز ان گیتوں کے لیے مصالحہ فراہم کرتے ہیں۔ ترنجن میں بیٹھی خواتین یا فصلوں میں ہل چلانے والا نوجوان ان گیتوں کو سُر میں گاتے ہیں تو ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔ ماں بچے کا لازوال رشتہ بھی ان گیتوں کا اٹوٹ انگ ہے۔ یوں یہ گیت پیدائش سے لے کر لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے تک کے موضوعات اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں پنجابی لوک گیتوں کی بہت سی اقسام ہیں: شادی، بیاہ کی مختلف رسومات کے لیے مختلف گیت ہیں مثلاً مہندی کے گیت، سہرے، گھوڑیاں، رخصتی وغیرہ کے گیت۔ اس کے علاوہ لوک گیتوں کی مختلف اصناف بھی ہیں جن میں لوری، ماہیا، ٹپہ، بولیاں، ڈھولا اور وین وغیرہ اہم ہیں۔ یہ گیت زندگی کی تصویر بھی ہیں اور تنقید بھی کہ کئی گیتوں میں تنقیدی رنگ بھی ملتا ہے۔

3.2.1۔ لوری:

لوری ماں کی بچے سے محبت کی عکاس ہوتی ہے۔ اس میں ماں اپنے بچے سے محبت کا اظہار کرتی ہے، کبھی وہ اس کی خوشیوں اور کامیابیوں کے لیے دعا کرتی ہے اور کبھی صحت و سلامتی کی۔ یہ عموماً مدہم سُر اور لے میں گائی جاتی ہیں۔ روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے اور سُلانے کے لیے یہ تریاق کا کام کرتی ہے، جب ماں اسے گنگناتی ہے تو ایسا بھینا بھینا اور خوابناک سماں پیدا کرتی ہے کہ بچہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس کی دھن تیکھی لیکن مختصر ہوتی ہے اور آخر میں موسیقیت سے لبریز ایک ہی صوتی آہنگ روح کو دل آویز سکون و طمانیت سے دوچار کر دیتا ہے۔ بعض اوقات اس صوتی آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے بے معنی بول بھی لوری کا حصہ بن جاتے ہیں۔

الھڑ بلھڑ باوے دا
باوا کنک لیاوے گا
باوی بہہ کے چھٹے گی
چھٹ بھڑولے پاوے گی
کاکا کھڑ کھڑ ہسے گا

ترجمہ: الھڑ بلھڑ باوے دا بے معنی لیکن صوتی آہنگ برقرار رکھنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ باوا (فرضی نام) گندم لائے گا، باوی بیٹھ کر اس کو چھانٹے گی اور چھانٹ کر بھڑولے میں ڈال دے گی۔ کاکا (بچہ) کھکھلا کر ہنسے گا۔

3.2.2۔ ماہیا:

پنجاب حسن و عشق کی سرزمین ہے۔ پیار اور محبت یہاں کے لوگوں کے خمیر میں رچا بسا ہے۔ اس لیے یہاں کے لوک گیتوں میں بھی پیار اور محبت کی چاشنی وافر ملتی ہے۔ ماہیا ایک ایسا ہی گیت ہے جس کے موضوعات میں حسن و عشق سر فہرست ہے۔ ماہیا کا لفظ ماہ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے چاند اور ماہیا یعنی چاند جیسا محبوب۔ ماہیا ڈیڑھ مصرعے کا ہوتا ہے۔ پہلا مصرعہ آدھا ہوتا ہے جس میں پنجابی تہذیب و ثقافت کی جھلک ہوتی ہے اور اگلا مصرعہ لمبا ہوتا ہے اور مکمل ہوتا ہے جس میں مفہوم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ گہرے جذبات بھی جھلکتے ہیں۔ پہلا مصرعہ، قافیہ اور آہنگ برقرار رکھنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔

سوہنے دا کِل ماہیا
لوکاں دیاں روون اکھیاں ساڈا روندا اے دل ماہیا

ترجمہ: سونے کا کیل ہے ماہیا لوگوں کی آنکھیں روتی ہیں اور ہمارا دل روتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے بقول ماہیے کا پہلا مصرعہ بھی اپنے اندر گہرے مفہوم و معنی رکھتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماہیا کا مضمون عشق و محبت پر مبنی ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں حکمت و دانش، مذہبی، سماجی اور معاشی فکر بھی ملتی ہے مثلاً زیر نظر ماہیا میں اسلامی تلمیح برتی گئی ہے۔

آری تے آری آ

اک دم یوسفؑ دا سار مصر پیاری آ

ترجمہ: آری پر آری ہے، حضرت یوسفؑ ایک ہیں اور سارا مصر ان کا خریدار ہے۔

3.2.3۔ ٹپہ:

ٹپہ بھی ماہیا کی طرز کا لوک گیت ہے جس میں پہلا مصرعہ آدھا اور دوسرا مکمل ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے میں ہی اصل مضمون، جذبہ یا خیال پیش کیا جاتا ہے۔ یہ خلوت کا نہیں جلوت کا گیت ہے۔ ایک گروہ پہلے ٹپے کے بول گاتا ہے دوسرا ان کا جواب دیتا ہے یوں مکالمے کے انداز میں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

پہلا گروہ: آلو مٹر پکائے ہوئے نیں

کھانے نیں تے کھالے، اسیں پیسے لائے ہوئے نیں

دوسرا گروہ: آلو مٹر پکائے ہوئے نیں

تسیں تے پکاندے نہیں، کسے ہور ولوں آئے ہوئے نیں

ترجمہ: پہلا گروہ: آلو مٹر پکائے ہوئے ہیں، کھانے ہیں تو کھالو، ہم نے پیسے خرچ کیے ہوئے ہیں۔

ترجمہ: دوسرا گروہ: آلو مٹر پکائے ہوئے ہیں، آپ تو پکاتے نہیں کسی اور نے بھیجے ہوں گے۔

ٹپے میں موضوعات کی رنگا رنگی موجود ہے۔ کہیں بہن بھائی کا اور باپ بیٹی کا پیار جھلکتا ہے تو کہیں دیور بھابھی اور سالی بہنوئی کی دلچسپ نوک جھونک ملتی ہے کہیں جدائی کا کرب ان میں سمایا ہوا ہے تو کہیں دیس کی محبت، کہیں ساس سسر کے مظالم کا تذکرہ ہے تو کہیں دوستوں کی بے لوث محبت کا، کہیں رومان غالب ہے تو کہیں تاریخ کے اوراق، یوں دین و دنیا کے موضوعات پر تاثیر الفاظ میں ٹپے میں عکس انداز ہوتے ہیں۔

ہیر الکھ سوالکھ دااے

دھیاں والیاں دیاں رب عزتاں رکھ دااے

ترجمہ: ہیر الاکھ سوالاکھ کا ہے بیٹی والوں کی عزت رب رکھتا ہے۔

3.2.4۔ جگنی:

جگنی کو پنجاب کا صوفیانہ لوک گیت کہا جاسکتا ہے۔ جگنی گلے میں پہنا جانے والا ایک گہنا ہے جس کے سات دھاگے ہوتے ہیں اور ہر ایک میں چمکدار موتی جڑے ہوتے ہیں۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جگنی جوگن سے نکلا ہے اور جوگن پاکیزگی کا راستہ دکھاتی ہے۔ تیسری روایت کے مطابق لفظ جگنو بگڑ کر جگنی بنا اور جگنو اپنی نور پاشی سے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اوپر دی گئی روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جگنی دراصل ایسی روشنی کی علامت ہے جو سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ بعض اوقات جگنی کو ایک جیتے جاگتے کردار میں مجسم کیا جاتا ہے جو کسی مسجد، مدرسے، گھر یا محل میں جا کر نصیحت آموز باتیں کرتی ہے:

جگنی جاوڑی مدرسے
منڈے لے کتاباں نسے
ماسٹر کھڑکی اوہلے ہسے
مینوں سونہہ بھراواں دی
میں فیر نہ آواں گی
ویر میریا جگنی کہندی اے
نام علی دا لہندی اے

ترجمہ: جگنی مدرسے داخل ہوئی، لڑکے کتابیں لے کر بھاگ گئے۔ ماسٹر کھڑکی کی اوٹ سے ہنستا ہے۔ مجھے بھائیوں کی قسم ہے میں پھر نہ آؤں گی میرے بھائی جگنی کہتی ہے۔ جو علی کا نام لیتی ہے۔

جگنی کا ایک انداز یہ ہے کہ اس میں کئی جگہوں پر اس کے رنگدار دھاگوں کی گنتی سے بولوں کو شروع کیا جاتا ہے:

میری جگنی دے دھاگے دو
در مرشد دے آن کھلو
تیرے اندر ہووے لو
او پیر میریا جگنی کہندی اے
جیہڑی نام علی دا لیندی اے

ترجمہ: میری جگنی کے دو دھاگے ہیں، مرشد کے دروازے پر کھڑے ہو جاؤ تا کہ تمہارے اندر روشنی ہو۔ اے میرے پیر جگنی کہتی ہے جو علی کا نام لیتی ہے۔

اگرچہ جگنی کے منہ سے ہر طرح کے موضوعات کہلوائے جاتے ہیں لیکن اول و آخر تصوف کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

3.2.5۔ ڈھولا

ڈھولا پنجاب کا منفرد لوک گیت ہے۔ ایک روایت کے مطابق ڈھول (ساز) کے ساتھ الف ندائیہ لگا کر ڈھولا بنا دیا گیا جس کا مطلب ہے: اے محبوب یوں اس لوک گیت میں محبوب کو ڈھولا کہہ کر مخاطب کر کے گیت گایا جاتا ہے۔ یہ درد و کرب، آہوں اور سسکاریوں کا گیت ہے۔ مذہبی، رومانی، اخلاقی، عشقیہ اور نعتیہ ڈھولے بھی ملتے ہیں۔ پنجابی زبان کے مختلف لہجوں میں موضوعاتی تغیر کے ساتھ ڈھولے رائج ہیں۔ مثلاً گنجی بار، نیلی آباد، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور ساہیوال کے علاقوں میں انگریزوں سے نفرت اور تحریک آزادی سے متعلق بہت سے ڈھولے تخلیق کیئے گئے ہیں جو زبان زدِ عام ہیں۔ ایک اہم مثال یہ ہے کہ رائے احمد خان کھرل اور انگریزوں کے درمیان گوگیرہ، ساہیوال کے علاقے میں ستمبر 1857ء کو جنگ ہوئی جہاں رائے احمد خان کھرل انگریزوں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور بعد ازاں مراد فتیانہ نے لارڈ برکلے کو قتل کر کے اپنے ساتھی رائے احمد خان کھرل کا بدلہ لیا۔ اس موضوع پر بہت سے ڈھولے تخلیق ہوئے۔ اس ضمن میں ڈھولے کا ایک حصہ درج کیا جاتا ہے جس میں پنجاب کی عوام کے انگریزوں کے خلاف جذبات دیکھے جاسکتے ہیں:

مہر مراد پیا آندا اے انگریز برکلی نوں　　برکلی کھلو کے سمجھیں گل ہماری

اگے ماریا ای بابے احمد نوں　　رنڈن کیتوای نیئں راوی

ترجمہ: مہر مراد فتیانہ نے انگریز اسسٹنٹ کمشنر برکلے کو کہا کہ میری بات کو غور سے سمجھنا۔ پہلے تم نے ہمارے بزرگ احمد خان کھرل کو شہید کر کے علاقہ راوی کی محفلیں ایسے سونی کر دی ہیں جیسے بیوہ کا سہاگ لٹ جائے۔

تیری میری سر دی بازی اے، ہتھوں ڈھلسی کیندے ساری

برکلی اوت ویلے موڈھے نال لائی اے، پھڑ کے بندوق دونالی

واہ و گائی سو فتیانے نوں، اوسدی بانہہ پھٹی اے کھبی، واگ آلی

ترجمہ: تیری میری سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی ہے، دیکھیں کون جیتے گا؟ برکلے نے فوراً دونالی بندوق سے مراد فتیانے پر فائر کر دیا۔ جس کے نتیجے کے میں پر مراد کا بایاں بازو زخمی ہوا جس سے انہوں نے گھوڑے کی لگام سنبھالی ہوئی تھی۔

فتیانے بھر کے کلمہ دین داسانگ جھکائی اے ہنے چوں انج چک لیا سو برکلی نوں

جیویں مٹ وچ بوڑ داے کے لچھا لیند اے چھک للاری

ڈھاندے برکلی نوں چنگیاں ماریاں ہن سوجھے بھدرُو

جیوں بھکھا باز طامے تے لاہندا اے اُڈ شکاری

ترجمہ: مراد فتیانے نے خدا کو یاد کرتے ہوئے انگریز پر نیزے کا بھرپور وار کیا۔ مراد کا نیزہ کاری نکلا۔ اس نے برکلے کو گھوڑے کی زین سے اس طرح اپنی طرف کھینچا جیسے رنگ ریز سوت کے لچھے کو مٹ میں سے اچھالتا ہے۔ گرتے ہوئے انگریز کو سوجھے مصلی نے اس طرح لیا جس طرح بھوکا باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور لاٹھی مار کر ہلاک کر دیا۔

ایک عشقیہ ڈھولا یوں ہے:

کنیں سوہنے بندے گل چولی لال اے

مینوں واہمے تیرے، تینوں ہور داخیال اے

لگیاں چشماں دامڑن محال اے

ترجمہ: کانوں میں خوبصورت بُندے اور سرخ رنگ کی چولی (قمیض) پہنی ہوئی ہے۔ مجھے تمہارے وہم ہیں اور تمہیں کوئی اور خیال ہے۔ جب آنکھیں چار ہو جائیں تو واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

3.2.6 بولیاں:

یہ ماجھے کے علاقے کی محبوب ترین صنف ہے۔ بولی ایک مصرعے کی ہوتی ہے۔ جو ہیئت اور مواد کے اعتبار سے جامع، ہمہ گیر اور گھمبیر تاثر لیے ہوتی ہے۔ سید احمد ندیم قاسمی اس صنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بولی اشاریت اور دل آویز ابہام کی انتہا ہے۔ دو تین لفظوں میں پورا واقعہ مکمل تجربہ اور طویل قصہ سمٹ آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی''

یہ ایک سطری گیت پڑھنے سننے والوں کے دلوں، دماغوں پر گہرا اثر کرتا ہے۔

اوتھے عملاں تے ہونے نبیڑے کسے نہیں تیری ذات پچھنی

ترجمہ: قیامت کے روز عمل کام آئے گا کوئی تمہاری ذات نہیں پوچھے گا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نہیں دسنا

ترجمہ: تمہارے سامنے بیٹھ کر رونا ہے اور تمہیں دکھ نہیں بتانا۔

نیلی گھوڑی وے وکیلا تیری جے پہلی پیشی یار چھٹ جائے

ترجمہ: اے وکیل نیلی گھوڑی (جو بیش قیمت گھوڑی ہے) تمہیں دان کر دوں گی اگر پہلی پیشی پر میرا محبوب رہا ہو جائے۔

وچ سکھاں دے یار بتھیرے دکھاں وچ کون دردی

ترجمہ: خوشی میں بہت دوست بن جاتے ہیں، دکھ میں کوئی ساتھ نہیں ہوتا

بولی انتہائی دلچسپ، گہری اور دل پذیر ہوتی ہے جو اپنے اندر کہاوت کا سارا اختصار، ماہیا کی کشش اور پنجاب کی مٹھاس لیے پڑھنے سننے والوں پر گہرا اثر کرتی ہے۔

3.2.7۔ چھلا:

جیسا کہ لفظ چھلا سے ظاہر ہے یہ انگلی میں پہنا جانے والا زیور ہے اور اس کے ساتھ، پیار، محبت کا ازلی جوڑ ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر تہذیب میں منگنی یا شادی بیاہ کے بندھن میں اس کا وجود لازم و ملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھلا رومانوی حیثیت رکھتا ہے اور اسی مناسبت سے چھلے کے گرد رومانوی موضوعات غالب رہتے ہیں۔ اس میں مصرعوں کی کوئی تعداد متعین نہیں ہوتی۔ یہ دو مصرعوں سے لے کر بے شمار مصرعوں کا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ رومان اس کا بنیادی موضوع ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں ہر موضوع پایا جاتا ہے۔

چھلا بیری بور اے

گھر ماہی دا دور اے

ونجنا لاضرور اے

اُڈاں بن کے طوطا

جتھے ماہی کھلوتا

ترجمہ: میرا چھلا بیری کے پھول کی طرح ہے۔ ساجن کا گھر دور ہے لیکن جانا بھی ضرور ہے۔ کاش طوطی ہوتی اور اڑ کر وہاں پہنچ جاتی جہاں ساجن کھڑا ہے۔

3.2.8 وین:

لوک گیت پیدائش سے لے کر وفات تک کے رسوم و رواج کے عکاس ہوتے ہیں۔ پنجابی وین ایسا لوک گیت ہے جو کسی کی وفات اور خاص طور پر جوان موت کے موقع پر بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے۔ اس میں آہ وزاری اور چیخ و پکار کے علاوہ مرنے والے کی بیوہ، بچیوں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کا ذکر رو رو کر کیا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر ہلکی آواز میں، رک رک کر آہ وزاری کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔

تیرے نکے نکے بال

توں اینہاں نوں لیندوں پال

ہائے ہائے شیرا

ترجمہ:

تمھارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تم ان کو پال لیتے ہائے ہائے شیرا

3.3۔ لوک بات (کہانی):

لوک بات یا لوک کہانی ایک ایسی داستان ہے جو عوامی ثقافت، روایات، اور عقائد کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ کہانیاں عموماً زبانی طور پر مختلف نسلوں کے درمیان منتقل ہوتی ہیں۔ لوک کہانیاں مختلف موضوعات پر ہو سکتی ہیں۔ زیادہ تر لوک کہانیاں اخلاقی سبق دیتی ہیں، جیسے سچائی، ایمانداری، یا محنت کی اہمیت۔ یہ کہانیاں کسی مخصوص ثقافت یا معاشرے کی روایات، رسومات اور عقائد کو اجاگر کرتی ہیں۔ اکثر لوک کہانیوں میں مافوق الفطرت کردار بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعے انسانی احساسات، خیالات، اور رویوں کی عکاسی کی جاتی ہے، جیسے کہ دوستیاں، دشمنیاں، وفاداری، یا خیانت۔ یہ کہانیاں سننے یا پڑھنے میں دلچسپ ہوتی ہیں اور عوامی تفریح کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات، لوک کہانیاں تاریخی واقعات یا شخصیات کے گرد گھومتی ہیں، جن میں عوامیاد گاریں شامل ہوتی ہیں۔ مجموعی طور پر، لوک کہانیاں عوامی فہم، ثقافتی ورثے، اور اخلاقی اقدار کو منتقل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ پنجابی لوک کہانیاں ہمیشہا خلاقی اسباق اور دلچسپ کرداروں سے بھری ہوتی ہیں۔ ایک مشہور کہانی "چڑیا اور کوا" ہے۔

''ایک بار کا ذکر ہے، ایک چڑیا اور ایک کوا ایک ہی درخت پر رہتے تھے۔ چڑیا اپنے میٹھے اور خوبصورت ترانے کے ساتھ سب کو خوش کرتی تھی۔ کوا، جو سیاہ اور بدصورت تھا، ہمیشہ چڑیا کو دیکھ کر جلتا رہتا تھا۔ ایک دن، چڑیا نے کوا سے کہا، "تم کیوں ہمیشہ جلتے رہتے ہو؟ زندگی کو خوشی سے گزارو۔" کوا بولا "جب تم گنگناتی ہو، لوگ تمہاری آواز کی تعریف کرتے ہیں، لیکن میرے بارے میں کیا؟" چڑیا نے اس کو سمجھایا، "سچی خوشی وہ ہے جب تم اپنے آپ کو پسند کرو، نہ کہ دوسروں کی رائے کے مطابق۔" کوا نے چڑیا کی بات سنی اور سوچا کہ خوش رہنے کا راز اپنے آپ کو قبول کرنا ہے۔ بعد میں، اس نے اپنی سیاہی کو قبول کیا اور ایک نیا گانا سیکھا۔ چڑیا کی طرح، وہ بھی اپنے گانے سے خوشیاں بانٹنے لگا''

اس کہانی کا سبق یہ ہے کہ سچی خوشی اپنے آپ کو قبول کرنے میں ہے، اور دوسروں کی سوچ سے اپنی خوشی کو متاثر نہ ہونے دو۔

3.4۔ بُجھارتیں:

پنجابی پہیلیاں، جنہیں "بُجھارتیں" کہا جاتا ہے، مختصر، ذہین بیانا تیا سوالات ہوتی ہیں جو سننے والے کو ایک معمہ پیش کرتی ہیں۔ یہ اکثر لفظی کھیل، استعارے، یا روزمرہ کی زندگی، قدرت یا ثقافتی حوالوں سے متعلق

تصورات کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کا مقصد سننے والے کی سوچ اور تخلیقی صلاحیتوں کو چیلنج کرنا ہے تا کہ وہ جواب تلاش کر سکیں۔ پہیلیاں تفریح، تعلیم، یا سماجی تعامل کے لیے استعمال کی جاتی ہیں، اور یہ پنجابی روایات اور زبانی ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ میلوں، جشن، دوستوں اور خاندان کے درمیان اشتراک کیا جاتا ہے تا کہ ذہنی آزمائش، مشغولیت اور تفریح فراہم کی جا سکے۔

بُجھارتیں (پہلیاں):

بُجھارت "اک واری جُھک دی، ساڈے نال وکھدی، سچھول دی، پھوٹی پھل دے وچ دی۔"

ترجمہ: "ایک بار جھکتی ہے، ہمارے ساتھ دکھائی دیتی ہے، سچ کو کھول دیتی ہے، پھل کے اندر پھوٹ دیتی ہے۔"

جواب: چابی (Key)

بُجھارت: "نکی جئی کُڑی، لے پرانده ٹری"

ترجمہ: "چھوٹی سی لڑکی، پرانده لے کے چلی۔"

جواب: سوئی دھاگہ

بُجھارت: "بنے سُوکھے پتھر، سر مادی کملی، نہ تے ہیرے توں جڑی، نہ تے کوئی تلکلی۔"

ترجمہ: "بنے خشک پتھر، سردیوں کی چادر، نہ تو ہیروں سے مزین، نہ تو کوئی تلکلی۔"

جواب: برف (Ice)

یہ پہیلیاں پنجابی ثقافت کا حصہ ہیں اور ان کا مقصد تفریح اور تفکر کو فروغ دینا ہے۔

3.5۔ ضرب الامثال / اکھان:

ضرب الامثال کو پنجابی میں اکھان یا کہاوت کہا جاتا ہے۔ یہ وہ آفاقی سچائیاں ہوتیں ہیں جو ہر دور میں ہر جگہ مسلم ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکھان دانشمندی کا وہ خزانہ ہیں جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ان میں صدیوں کے تجربات کا نچوڑ چند الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ پڑھنے سننے والے کا ذہن بغیر کسی دقت کے دانش مندی کی بات پالیتا ہے۔ ان کے الفاظ میں گہری تاثیر ہوتی ہے لیکن یہ دماغ کو بوجھل پن کا شکار نہیں کرتے، یہ وہ اقوال ہوتے ہیں جن کے پیچھے بزرگوں کے صدیوں کے تجربات و مشاہدات معاشرے کے رسوم و رواج، رہن سہن اور تاریخ کا مطالعہ چھپا ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور عوام کی خواہشات و جذبات کے عکاس بھی ہوتے ہیں۔ پنجابی زبان اس لحاظ سے بڑی ثروت مند ہے کہ اس میں اکھانوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ پنجابی اکّھان (کہاوتیں) ایک مضبوط لوک ورثہ ہیں جو پنجابی زبان اور ثقافت میں گہری جڑیں رکھتی ہیں۔ یہ کہاوتیں نہ صرف سادہ الفاظ

میں زندگی کے پیچیدہ تجربات کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ عام لوگوں کی حکمت اور فطرت کے گہرے مشاہدات کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ یہ اکھان زندگی کے مختلف پہلوؤں، حالات، اور تجربات کی عکاسی کرتے ہیں، اور عام لوگوں کو ایک سبق دینے یا ہدایت کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک مختصر جملہ ہوتا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا فلسفہ اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

آیئے کچھ مشہور پنجابی اکھان اور ان کا اردو ترجمہ اور مفہوم دیکھتے ہیں:

1. "کُتاں دے پُتّر نوں خوش رکھ، ضرورت پئے تے کم آوے"

اردو ترجمہ:

کتے کے بچوں کو خوش رکھو، ضرورت پڑے تو کام آئیں گے۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخص چھوٹا یا کمزور نہیں ہے۔ کبھی کبھار وہ لوگ جنہیں ہم کم اہمیت دیتے ہیں، مشکل وقت میں ہمارے بہت کام آسکتے ہیں۔ اس لیے ہر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے تاکہ جب ضرورت ہو، تو وہ مددگار ثابت ہوں۔

2. "چور چور موسیرے بھائی"

اردو ترجمہ:

چور چور کے بھائی ہوتے ہیں۔

مفہوم:

یہ اکھان اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ برے لوگ اکثر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں یا برے کاموں میں ایک دوسرے کے حامی ہوتے ہیں۔ یہ اکثر ان موقعوں پر استعمال ہوتی ہے جب لوگ غلط کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔

3. "جے توں میوہ کھاناں تے بوٹا وی لاناں"

اردو ترجمہ:

اگر تم پھل کھانا چاہتے ہو، تو درخت بھی لگانا ہو گا۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب ہے کہ اگر آپ کو زندگی میں کسی چیز کا پھل چاہیے تو پہلے محنت کرنا ہو گی۔ کوئی بھی چیز بغیر کوشش کے حاصل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ درخت لگانے کے بعد ہی اس کے پھل ملتے ہیں، اسی طرح کامیابی کے لیے محنت ضروری ہے۔

4. "اپنے پلے کچھ نہیں تے لوندا پھرے خیرات"

اردو ترجمہ:

اپنے پاس کچھ نہیں اور دوسروں کو خیرات بانٹتا ہے۔

مفہوم:

اس اکھان سے مراد ہے کہ کوئی شخص اپنی حیثیت سے بڑھ کر دکھاوا کرتا ہے، یا جب اس کے پاس خود کچھ نہ ہو لیکن وہ دوسروں کی مدد کرنے کا دعویٰ کرے۔ یہ خود فریبی اور جھوٹے دکھاوے پر طنز کرتا ہے۔

5. "چڑھدی کلا وچ رہنا"

اردو ترجمہ:

ہمیشہ بلند حوصلے میں رہنا۔

مفہوم:

یہ ایک مثبت پنجابی اکھان ہے جس کا مطلب ہے کہ ہمیشہ حوصلے اور امید کو بلند رکھو، چاہے حالات کیسے بھی ہوں۔ یہ زندگی میں مثبت رویہ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔

6. "ہنیرے دا پیر، اجالے نئیں آسکدا"

اردو ترجمہ:

اندھیرے کا پیر، روشنی میں نہیں آسکتا۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب ہے کہ برے لوگ ہمیشہ اپنے برے کاموں میں ہی مگن رہتے ہیں اور وہ حق یا سچ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ کہاوت اکثر ان لوگوں کے بارے میں کہی جاتی ہے جو بدعنوان یا جھوٹے ہوتے ہیں اور سچائی سے دور بھاگتے ہیں۔

7. "جتھے کماؤ، اوتھے کھاؤ"

اردو ترجمہ:

جہاں کماتے ہو، وہیں کھاؤ۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو وہاں خرچ کرنا چاہیے جہاں سے اسے رزق ملتا ہے۔ یعنی جہاں محنت کر کے روزی کماتے ہو، وہیں اپنے وسائل کو خرچ کرو تا کہ تمہاری زمین یا کاروبار پھلتا پھولتا رہے۔ اس میں ایک مالی ذمہ داری اور معاشرتی بھلائی کا درس دیا جاتا ہے کہ اپنے وسائل کو اپنے معاشرتی اور مالی ماحول میں ہی استعمال کرو تا کہ تمہاری معیشت بہتر ہو۔

8. ''وڈے بابے، وڈے پھکڑ''

اردو ترجمہ:

بڑے بڑے بابے، بڑے بڑے فقیری دکھاوے۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب ہے کہ بعض لوگ اپنی حیثیت یا بزرگی کا بہت دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کہاوت خاص طور پر ان لوگوں کے بارے میں کہی جاتی ہے جو دوسروں کو دھوکہ دینے یا اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ حقیقت میں وہ خالی ہوتے ہیں۔ یہ طنز کے طور پر برتا جاتا ہے۔

9۔ ''آپ بھلے تے جگ بھلا''

اردو ترجمہ:

اپنا بھلا کرو گے تو دنیا کا بھلا ہو گا۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان خود اچھا ہو، یعنی اس کا کردار اور نیت درست ہو، تو وہ دنیا کو بھی اچھا دیکھے گا۔ اس میں خود اصلاحی کا پیغام ہے کہ اپنی ذات کو سنوارو تو تمہارا ماحول اور دنیا تمہیں بہتر نظر آئے گی۔ یہ ایک اخلاقی سبق ہے کہ اچھائی کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے کرنا چاہیے۔

10. ''جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی''

اردو ترجمہ:

جہاں کی گدھی تھی، وہیں واپس آ کھڑی ہوئی۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب ہے کہ ہر چیز اپنی اصل جگہ پر واپس آ جاتی ہے۔ چاہے جتنا بھی بدلنے کی کوشش کی جائے، حقیقت سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اکثر ان لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے جو کسی نئی جگہ یا نئی حالت میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن آخر کار وہی اصل حالت میں واپس آ جاتے ہیں۔

11. ''چور چوری تو جائے، ہیرا پھیری تو نہ جائے''

اردو ترجمہ:

چور چوری سے باز آ سکتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔

مفہوم:

اس اکھان کا مطلب ہے کہ برے عادات کے حامل افراد شاید کسی بڑی برائی سے رک جائیں لیکن ان کی فطرت میں چھوٹے موٹے دھوکے بازیاں یا فریب دینے کی عادت باقی رہتی ہے۔ یہ اکثر ان لوگوں کے لئے کہا جاتا ہے جو ظاہری طور پر اپنی عادتیں بدلنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اندر سے وہی رہتے ہیں۔

12. ''دشمناں وچ انج رہو، جیویں دنداں وچ جیبھ''

اردو ترجمہ:

دشمنوں کے درمیان اس طرح رہو جس طرح دانتوں کے درمیان زبان۔

مفہوم:

مطلب یہ کہ دانت باتیں کرتے یا کھانا وغیرہ کھاتے ہوئے آپس میں ملتے رہتے ہیں۔ انہی اعمال کے درمیان زبان بھی حرکت کرتی ہے لیکن دانتوں کے درمیان آ کر کٹنے سے محفوظ رہتی ہے۔ یعنی زبان ہر حرکت اور عمل میں اپنے آپ کو دانتوں کی گرفت سے بچاتی ہے۔ دشمن بھی انسان کے لیے اسی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا ساتھ بھی دانتوں اور زبان کے ساتھ کی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان کو دشمنوں سے ہر گھڑی ہوشیار رہنا چاہے۔

یہ اکھان پنجابی زبان کی ثقافتی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں اور ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان کا اطلاق عام طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان میں نہ صرف حکمت بلکہ طنز اور حقیقت کی گہری عکاسی بھی شامل ہے، جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتی ہے۔ یہ اکھان پنجابی زبان کی لوک دانش کی عکاسی کرتے ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں طنز، سبق اور حکمت موجود ہوتی ہے، جو لوگوں کی زندگی کے تجربات سے کشید کی جاتی ہیں۔ اکھان روزمرہ زندگی کے تجربات اور دانش پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں گہرے معانی اور زندگی کی سچائیوں کا عکس ہوتا ہے۔ پنجابی اکھانوں کا استعمال صرف زبان کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لئے نہیں کیا جاتا بلکہ ان سے عملی زندگی کے بہت سے مسائل اور رویوں کی نشاندہی کی جاتی ہے

3.6۔پنجابی محاورہ:

محاورہ(Idiom)زبان کی خوبصورتی اور اظہار کی ایک موثر شکل ہے جو ایک مخصوص جملہ یا فقرہ ہوتا ہے اور اپنے ظاہری معنی کی بجائے ایک مجازی یا معنوی مفہوم رکھتا ہے۔ یہ مختصر اور جامع الفاظ میں بڑے خیالات، احساسات یا واقعات کو بیان کرنے کا ایک بہترین طریقہ ہوتا ہے۔

محاورے کی خصوصیات:

مخصوص مفہوم:

محاورہ ہمیشہ اپنے ظاہری الفاظ کی بجائے ایک مخصوص اور طے شدہ معنوی مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً "اٹ وٹے داویر ہونا" دو افراد میں سخت دشمنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ ماجد تے ساجد دے وچ اٹ وٹے داویر وے (ترجمہ: ماجد اور ساجد میں سخت دشمنی ہے)

جامعیت:

محاورے میں زیادہ الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ کم سے کم الفاظ میں ایک مکمل اور واضح پیغام پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر محاورہ ایک مخصوص مطلب یا پیغام دیتا ہے اور اس کا استعمال ایک خاص موقع پر کیا جاتا ہے۔

قدرتی زبان کا حصہ:

محاورات عام طور پر صدیوں پرانی روایات اور ثقافتوں سے وابستہ ہوتے ہیں اور زبانی روایت کا ایک حصہ بنتے ہیں۔

روزمرہ زندگی کا عکس:

اکثر محاورے عام زندگی کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں، جیسے "آدھا تیتر، آدھا بٹیر ہونا" کسی غیر واضح یا ملے جلے معاملے کی نشاندہی کرتا ہے۔

مصدر:

محاورے کا اختتام ہمیشہ مصدر پر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند محاورے ملاحظہ ہوں

کنوں کن خبر نہ ہونا (کسی بات کی خبر نہ ہونا یعنی کسی بات کو خفیہ رکھنا)

متھے تے اکھاں رکھنا (مغرور ہونا)

ٹیں ٹیں کرنا (زیادہ باتیں کرنا)

روایت:

محاورے اکثر زبان میں ایک روایت کے طور پر نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق عوامی زندگی اور روزمرہ کے تجربات سے ہوتا ہے۔

استعارہ:

زیادہ تر محاورات میں استعارے کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "اٹ وٹے داویر ہونا" یعنی سخت دشمنی ظاہر کرنے کے لیے اٹ (اینٹ) وٹا (پتھر) کا استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

محاورے کا استعمال:

محاورے کا استعمال زبان میں جذبات اور معنویت کو بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ جب ہم کسی گفتگو یا تحریر میں محاورہ استعمال کرتے ہیں تو سامع یا قاری کو آسانی سے بات کا مقصد سمجھ میں آ جاتا ہے کیونکہ یہ محاورے معاشرتی تجربات اور ثقافت سے جڑے ہوتے ہیں۔

محاوروں کی اقسام:

روایتی محاورے: یہ وہ محاورے ہیں جو عام طور پر صدیوں سے مختلف زبانوں اور علاقوں میں استعمال ہوتے آ رہے ہیں، مثلاً "اک اکھ نال ویکھنا"۔

علاقائی محاورے:

مختلف علاقوں اور زبانوں میں بولے جانے والے محاورے جو مخصوص علاقے کی زبان اور ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں۔ مثلاً کھنڈ کھیر ہونا (بہت زیادہ اتفاق ہونا/ ایک ہونا)

نئے محاورے:

وقت کے ساتھ ساتھ، معاشرتی تبدیلیوں اور ترقی کی بدولت نئے محاورے بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ ٹیکنالوجی کے دور میں "آن لائن ہونا" یا "نیٹ ورکنگ کرنا"۔

محاورے زبان کا ایک اہم حصہ ہیں اور ان کے ذریعے ہم اپنی بات کو مختصر، جامع اور موثر انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ ان کا استعمال زبان کو زندہ، دلچسپ اور رنگین بناتا ہے۔ محاورے کسی زبان کو مزید مؤثر اور خوبصورت بناتے ہیں۔ وہ نہ صرف زبان کو رواں اور شگفتہ بناتے ہیں بلکہ ان سے گفتگو میں رنگینی اور دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ محاورات عام فہم ہوتے ہیں اور عوامی زبان میں بڑی تیزی سے قبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا استعمال کسی شخص کی بات چیت کو بامعنی اور دلکش بناتا ہے۔

دیگر زبانوں کی طرح پنجابی میں بھی محاورات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے جو ہماری ثقافت، تہذیب اور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے۔ محاورات کو سمجھنا اور ان کا صحیح استعمال زبان دانی کے لیے نہایت ضروری ہے، کیوں کہ یہ زبان کے فکری اور جذباتی اظہار کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔

مثالیں:

کن بھرنا

ترجمہ: کسی کے خلاف بھڑکانا

متھیوں دُکھنا

ترجمہ: کسی کا بُرا لگنا

اک اکھ نال ویکھنا

ترجمہ: سب کو برابر دیکھنا یا سمجھنا

سر متھے تے رکھنا

ترجمہ: کسی کو عزت دینا

اکھیاں متھے تے رکھنا

ترجمہ: مغرور ہونا

خود آزمائی

1۔ لوک ادب کی تعریف کیجیے اور اس کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالیے۔

2۔ پنجابی لوک گیتوں کی اقسام بیان کیجیے اور معروف لوک گیتوں کی مثالیں بھی دیجیے۔

3۔ اکھان کی تعریف کیجیے اور چند اکھان مفہوم و معنی کے ساتھ تحریر کیجیے۔

4۔ لوک بات اور بجھارت پر نوٹ تحریر کیجیے۔

5۔ محاورہ کی تعریف، خصوصیات اور استعمال بیان کیجیے۔

یونٹ نمبر:4

لوک قصے اور داستانیں

تحریر:ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی:ڈاکٹر عائشہ رحمٰن

فہرست

یونٹ کا تعارف		67
مقاصد		67
4.1	تعارف	68
4.2	ہیر رانجھا	68
4.3	مرزا صاحباں	72
4.4	سوہنی مہینوال	74
4.5	پورن بھگت	75
خود آزمائی		77

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

پنجابی لوک قصے اور داستانیں پنجاب کے لوک ادب کا اہم حصہ ہیں، جو صدیوں سے عوام میں مقبول ہیں۔ یہ داستانیں نہ صرف پنجاب کی ثقافت اور روایات کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ محبت، وفا اور انسانی جذبات کی گہری تصویر بھی پیش کرتی ہیں۔ ان لوک کہانیوں میں "ہیر رانجھا"، "مرزا صاحباں"، "سوہنی مہینوال" اور "پورن بھگت" جیسے مشہور قصے شامل ہیں، جو لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ یہ تمام داستانیں پنجاب کی ثقافت کا گہرا عکس ہیں اور پنجاب کے لوگوں کے جذبے، محبت اور قربانی کی عظمت کو اجاگر کرتی ہیں۔ اس یونٹ میں آپ پنجاب کی رومانوی داستانوں کے بارے میں پڑھیں گے اور اُن میں پنہاں، وفا، جدوجہد، بہادری، عشق مجازی و حقیقی جیسے اسباق سے بھی روشناس ہو سکیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ داستان ہیر رانجھا کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں۔

2۔ مرزا صاحباں کی داستان کے بارے میں جان سکیں۔

3۔ اس نکتے کو سمجھ سکیں کہ سوہنی مہینوال کی کہانی محبت اور قربانی کا استعارہ ہے۔

4۔ پورن بھگت کی کہانی سے روشناس ہو سکیں۔

لوک قصے اور داستانیں

4.1 تعارف:

انسانی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی سوچ کا سب سے قدیم اظہار کہانی ہے۔ ابتدا سے ہی انسان کہانی کے ذریعے اپنا اور دوسروں کا دل بہلاتا رہا ہے یوں داستان کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنا کہ انسان کا وجود، انسانی سماج اور تہذیبی شعور۔ کسی بھی علاقے کی لوک داستانیں اس کی پہچان ہوتیں ہیں، ان سے خطے کے معاشی، تاریخی، عمرانی، ثقافتی، مذہبی و نفسیاتی عوامل عیاں ہوتے ہیں۔ یہ داستانیں اخلاق و عرفان، حسن و عشق، جرات و شجاعت، عزم و ہمت اور تہذیب و ثقافت کی امین ہوتی ہیں اور ان کے کردار جداگانہ فعالیت اور معنویت رکھتے ہیں۔

پنجاب اور پنجابی زبان کا مزاج خالص مشرقی ہے۔ یہاں کے لوک قصے حسن و عشق، جدوجہد، بہادری، نیکی و بدی، وفاو بے وفائی اور حسد وغیرہ جیسے اوصاف رکھتے ہیں، جو دار صل تصوف اور روحانیت اور اس راہ پر جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کی علامتیں ہیں۔ مجازی رنگ میں حقیقت کو پالینے کی جستجو ان داستانوں کا خاصا ہے۔

اگر سرسری طور پر دیکھا جائے تو یہ کہانیاں رومانی نظر آتی ہیں جن کا انجام المناک ہوتا ہے۔ ہیر و اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگاتا ہے مگر خالی ہاتھ رہتا ہے حتیٰ کہ اپنی جان بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ یہ داستانیں جہد مسلسل کا درس دیتی ہیں، ان میں رقیب کا کردار عوام کی فطری خواہشات کا گلا گھوٹنے کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ پنجابی ادب میں بہت سی اخلاقی، مذہبی، تاریخی اور عشقیہ داستانیں ملتی ہیں پنجابی کے کلاسیکی شعرا نے دیسی و بدیسی داستانوں کو بہترین انداز سے منظوم کیا ہے لیکن یہاں محض پانچ دریاوں کی دھرتی پر جنم لینے والی مشہور و معروف داستانیں ہیر رانجھا، مرزا صاحباں، سوہنی مہینوال اور پورن بھگت شامل کی جارہی ہیں۔

4.2 ہیر رانجھا:

پنجاب کی دھرتی پر رونما ہونے والے اس قصے کی تاریخ کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کچھ محققین کا خیال ہے کہ یہ شہنشاہ اکبر کے دور کا واقعہ ہے اور کچھ محققین اس کو بہلول لودھی کے دور کا بتاتے ہیں۔ پنجابی میں یہ سب سے پہلے دمودر نام کے شاعر نے تحریر کیا لیکن سب سے زیادہ شہرت وارث شاہ کی تخلیق کردہ ہیر کو ملی اور اس کی ہیر کا شمار ادبیات عالم میں کیا جاتا ہے۔ وارث شاہ کی ہیر کو آئینہ پنجاب اور پنجاب کا انسائیکلوپیڈیا بھی کہا جاتا ہے۔

تخت ہزارہ میں رانجھا نامی ایک قوم آباد تھی اور اس گاؤں کے چوہدری کا نام موجو تھا جس کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ دھیدو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور موجو چوہدری کا لاڈلا بیٹا تھا۔ باپ کا دھیدو سے بے پناہ پیار دیکھ کر دوسرے بھائی اس سے جلتے تھے۔ یہاں قسمت پلٹا کھاتی ہے اور موجو چوہدری کا انتقال ہو جاتا ہے۔ باپ کی وفات کے بعد دھیدو کے بھائی زمین جائیداد کا بٹوارہ اس طرح کرتے ہیں کہ خود زرخیز زمین رکھ لیتے ہیں اور بنجر کلر زدہ دھیدو کو دیتے ہیں۔ بات بات پر دھیدو کی بھابیاں اس کو نکمے پن کا طعنہ دیتی ہیں۔ ایک دن بھابیاں اس کو طعنہ دیتی ہیں کہ اگر ہم تمہیں پسند نہیں تو ہیر سیال کو بیاہ لاو۔ دھیدو طیش میں آکر کہتا ہے کہ اگر تم مجھے یہ مشورہ دیتی ہو تو میں ایسا ہی کروں گا اور ہیر کو بیاہ لاوں گا۔ ہیر جھنگ کے نواب خاندان سیال سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے باپ کا نام چوچک اور والدہ کا نام ملکی تھا۔ ہیر کی خوبصورتی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے گھر سے نکل پڑتا ہے، اس کے بھائی اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں مانتا۔ ہیر کے گاؤں جاتے ہوئے وہ رات مسجد میں گزارتا ہے اور پھر صبح کشتی پر بیٹھ کر ندی پار کر کے ہیر کے گاوں پہنچتا ہے۔ ندی کے کنارے ہیر کا پلنگ پڑا ہوا تھا جہاں بیٹھ کر وہ بانسری بجانا شروع کر دیتا ہے۔ دھیدو کے پلنگ پر بیٹھنے کی خبر ہیر کو ہو جاتی ہے، وہ ساٹھ سہیلیوں کے ہمراہ وہاں پہنچتی ہے اور غصے سے آگ بگولہ ہو کر دھیدو رانجھے سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیتی ہے۔ رانجھا واہ سجن کہہ کر پلنگ سے اٹھا تو ہیر شرمندگی سے مسکرا دی۔ رانجھے کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر ہیر اس پر دل و جان سے فدا ہو جاتی ہے۔ ہیر اور رانجھے کی محبت پروان چڑھنا شروع ہو جاتی ہے اور چھپ چھپ کر ملنے کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔

رانجھا بے روزگار تھا، ہیر اپنے باپ سے سفارش کر کے اسے اپنے گھر بھینسیں چرانے کے لیے ملازم رکھوا لیتی ہے۔ رانجھا ہیر کی بھینسیں چرانے کے لیے جنگل بیلے چلا جاتا اور ہیر دیسی گھی میں چوری تیار کر کے رانجھے کے لیے لے جاتی۔ اس بات کی خبر ہیر کے لنگڑے چچا کیدو کو ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بات ہیر کے والدین کو بتاتا ہے لیکن وہ اس پہ یقین نہیں کرتے۔ وہ بارہا ہیر کے والدین کو خبردار کرتا ہے کہ ہیر خاندان کی عزت برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ آخر ایک روز کیدو چوچک کو جنگل لے جاتا ہے اور ہیر رانجھے کی ملاقات کا مشاہدہ کرواتا ہے۔ گھر واپس آکر چوچک رانجھے کو نوکری سے نکال دیتا ہے اور ہیر کا رشتہ سیدو قوم کھیڑا گاؤں رنگ پور طے کر دیتا ہے۔ رانجھا ہیر کی بھینسوں کو اپنی بانسری کی لے (سُر) پر لگا چکا ہوتا ہے۔ اب وہ کھانا، پینا اور دودھ دینا بند کر دیتیں ہیں۔ ہیر کی ماں ملکی اپنے خاوند کو کہتی ہے کہ بھینسیں کمزور ہو رہی ہیں، دودھ بھی نہیں دیتیں۔ ہم رانجھے کو دوبارہ ملازم رکھ لیتے ہیں، ویسے بھی کچھ دنوں میں ہیر کی شادی ہو جائے گی۔ چوچک یہ بات مان جاتا ہے اور دوبارہ رانجھے کی ملازمت بحال کر دیتا ہے۔

ہیر رانجھے کو کہتی ہے کہ گھر سے بھاگ جاتے ہیں مگر رانجھا یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے:

ہیرے عشق نہ مول سواد دیندا چوریاں نال ادھالیاں دے

ترجمہ:

ہیر عشق میں چوری یا بھاگ جانے کا کوئی مزہ نہیں۔

ہیر کی شادی کا دن آ پہنچتا ہے اور اس کا نکاح زبردستی سیدو کھیڑے سے کر کے اسے رنگ پور رخصت کر دیا جاتا ہے۔ یہاں ہیر چیختی ہے:

لے وے رانجھیا، واء میں لا تھکی میرے وس تھی گل بے وس ہوئی

قاضی ماپیاں، بھائیاں بھن ٹوری، مینڈی تینڈری ہن بس ہوئی

ترجمہ:

رانجھے قاضی، ماں باپ، بھائیوں نے مجھے باندھ کر زبردستی رخصت کر دیا ہے۔ میرا کوئی بس نہیں چلتا، میں نے اپنا پورا زور لگایا لیکن اب میری تمہاری کہانی ختم ہوئی۔

ہیر اپنے سسرال پہنچ کر بھی مضطرب رہتی ہے، وہ رانجھے کے لئے اداس و پریشان رہنے لگی۔ اس نے سیدو کھیڑے کو اپنا خاوند تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہیر کی ایک نہایت چالاک نند سہتی تھی جو بہت جھگڑالو تھی، شروع میں تو وہ ہیر سے لڑائی کرتی ہے لیکن چوں کہ وہ مراد بلوچ نامی شخص کی محبت میں گرفتار تھی، اس لیے بعد میں ہیر سے مل کر منصوبہ بندی کرتی ہے۔ رانجھا ہیر کے لیے بے قرار تھا۔ وہ ایک ہندو بالناتھ کو اپنا مرشد بناتا ہے اور اس کے مشورے پر جوگی کا روپ دھار کر ہیر کے سسرالی گاؤں رنگ پور روانہ ہو جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ ہیر کے در پر خیرات مانگتا ہے۔ کھیڑوں کی خواتین جن میں ہیر اور سہتی بھی شامل تھیں، باہر آ کر رانجھے کو دیکھتی ہیں۔ ہیر رانجھے کو پہچان لیتی ہے اور رانجھا بھی اس کا دیدار کر لیتا ہے۔ رانجھا رنگ پور قیام کر لیتا ہے اور خیرات کے بہانے ہیر کا دیدار کر لیتا ہے۔ سہتی اور ہیر مل کر منصوبہ بناتی ہیں اور ہیر ڈرامہ کرتی ہے کہ اس کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔ سہتی کہتی ہے کہ سانپ ڈسنے کا علاج اُس جوگی کے پاس ہے چنانچہ جوگی کو بلایا جاتا ہے جو کہتا ہے کہ اس کا علاج بند کمرے میں ہو گا اور صرف ایک غیر شادی شدہ لڑکی ساتھ ہو گی۔ ہیر، رانجھا اور سہتی کو کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے تاکہ جوگی منتروں کے ذریعے ہیر کو صحت یاب کرے۔ یہ تینوں مل کر کمرے کی دیوار میں نقب لگاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ سہتی مراد کے ساتھ چلی جاتی ہے اور ہیر رانجھے کے ساتھ۔

یہاں تک کہ واقعات پر سب محققین، قصہ گو اور داستاں گو متفق ہیں لیکن اس کے بعد کے واقعات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کھیڑوں نے ہیر اور رانجھا دونوں کو جنگل میں قتل کر دیا تھا، کچھ کہتے ہیں کہ سیالوں نے ان کو اپنے گاؤں کے قریب قتل کر دیا تھا۔ کچھ نے لکھا ہے کہ رانجھے کو قتل کر دیا گیا تھا اور ہیر اپنے محل واپس چلی گئی تھی۔ وارث شاہ لکھتا ہے کہ ان کا مقدمہ راجہ عدلی کی عدالت میں پیش کیا گیا تھا جس نے ہیر کو رانجھے کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ سیال قبیلہ نے اب پینترا بدلا اور کہا کہ رانجھا بارات لے کر آئے، ہم ہیر کو باقاعدہ اس کے ساتھ رخصت کریں گے۔ اس بات پر رانجھا خوش ہو کر اپنے گاؤں روانہ ہو جاتا ہے اور شادی کی تیاریاں شروع کر دیتا ہے۔ ہیر کے والدین اسے گھر لے آتے ہیں اور زہر دے کر مار دیتے ہیں اور قاصد کے ہاتھ رانجھے کو ہیر کے دنیا سے کوچ کرنے کا پیغام بھیجتے ہیں جس کو سن کر رانجھے کی روح بھی پرواز کر جاتی ہے۔

پنجابی زبان کی اس لازوال داستان کے کرداروں کو حقیقی عشق کی علامت بنا کر پنجابی اور سندھی صوفی شعرا نے اپنے کلام میں بارہا پیش کیا ہے۔ شاہ حسین، بابابلھے شاہ، حافظ برخوردار، خواجہ غلام فرید، سچل سرمست سمیت جہد مسلسل کی یہ داستان محبوب حقیقی کے قرب کو پانے کی علامت ہے۔ وارث شاہ نے اپنے کلام میں بھی اس طرف کئی اشارے کیے ہیں۔ وارث شاہ کی منظوم ہیر بے شمار فنی و فکری خوبیوں کا مرقع ہے۔ اس داستان میں وہ کئی جگہوں پر آفاقی سچائیوں کو اشعار میں پروتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مصرعے زبان زدِ عام ہیں اور ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

- کیجیئے حسن دامان نہ بھاگ بھریئے، چھل جائیسی روپ وچاریئے نی
- وارث شاہ اور سدا ای جیوندے نیں جنہاں کیتیاں نیک کمائیاں نیں
- وارث شاہ عادتاں جاندیاں نہیں، بھاویں کیٹے پوریاں پوریاں نی
- وارث حق دے تھوں جدوں حق کھتھا، تھر تھلیائے، عرش رب داتدوں
- وارث شاہ مان نہ کر وارثاں دا، رب بے وارثاں کر کے مار داای

ترجمہ:

- حُسن کا مان نہ کر اے بھاگ بھریئے (لڑکی کا نام) یہ ایک دن ڈھل جائے گا۔
- وارث شاہ وہ ہمیشہ جیتے ہیں جو نیک عمل کرتے ہیں۔
- وارث شاہ عادتیں نہیں جاتیں بے شک پور پور کاٹ دی جائے۔
- وارث شاہ جب کسی نے کسی کا حق چھینا تو رب کا عرش بھی کانپ اُٹھا۔

- وارث شاہ وارثوں پہ غرور نہ کر رب لا وارث کر کے مارتا ہے۔

4.3 مرزا صاحباں:

بلال زبیری اپنی کتاب "جھنگ دیاں لوک کہانیاں" میں لکھتے ہیں کہ مرزا صاحباں کا قصہ مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد کا ہے۔ پیلو وہ شاعر تھا جس نے اسے سب سے پہلے منظوم کیا لیکن افسوس کہ اس کے احوال و آثار مکمل طور پر بازیافت نہیں کیے جا سکے۔ ایک مستشرق رچرڈ سی ٹمپل نے کچھ جاٹوں سے یہ داستان سن کر اسے قلم بند کیا اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ کیا۔ اس نے اس داستان کو اپنی کتاب "لیجنڈز آف پنجاب" کی تیسری جلد میں شامل کیا جو پہلی دفعہ 1900ء میں منظر عام پر آئی۔

صاحباں کا باپ "خان کھیوا" اپنے قبیلے کا سردار بنا تو مرزا کی ماں نے اسے اپنے دودھ شریک بھائی کے پاس تعلیم و تربیت کے لیے بھیج دیا۔ مرزا کے ماموں خان کھیوے کی ایک بیٹی صاحباں اس کی ہم عمر تھی۔ بچپن میں دونوں اکٹھے مدرسے جاتے تھے اور اسی کم عمری میں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ استاد نے چھڑی سے مرزا کو مارا تو صاحباں نے اپنی ہتھیلی بند کر لی اور جب کھولی تو اس پر چھڑی مارنے کے نشان تھے۔ یہ بات گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کھیوے خاں کو جب اس بات کا پتہ چلتا ہے تو وہ مرزا کو واپس اس کی ماں کے پاس بھیج دیتا ہے، وہ قبیلے کا سردار تھا اور مرزا کا تعلق عام گھرانے سے تھا اس لیے وہ اس رشتے کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھا لیکن اس وقت تک مرزا صاحباں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ وقت گزرتا گیا مرزا پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک بہترین تیر انداز اور گھڑ سوار بن چکا تھا۔ صاحباں کا ایک ملازم کرموں تھا جو ان دونوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد صاحباں کا رشتہ چدھڑ خاندان میں طے کر دیا گیا اور مرزا کی ماں نے بھی اس کا رشتہ شاہی خاندان میں طے کر دیا۔ جب صاحباں کی شادی کی تیاریاں شروع ہوتیں ہیں تو وہ کرموں کے ہاتھ مرزا کو پیغام بھجواتی ہے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ جب مرزا کو پیغام ملتا ہے تو وہ اپنی تیز رفتار گھوڑی جس کا نام بکی تھا پر تیر کمان سے لیس ہو کر صاحباں کے گاوں کا رخ کرتا ہے۔ اس وقت مرزا کی بہن کی شادی ہو رہی تھی اسی وجہ سے اس کے ماں باپ اور بہن اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسے عشق میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

ادھر وہ کہتا ہے کہ:

ویاہ ہووے چھڈ دیواں، منگ نہ چھڈی جا
جے کر منگ میں چھد دیواں لگے گھر لاں نوں لاج

ترجمہ:

بیوی کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن منگیتر کو نہیں اور اگر منگیر کو چھوڑ دوں تو کھرل ذات کی بے عزتی ہو گی۔

محققین جب مرزا اور رانجھا کے کردار کا تقابل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مرزا بہادر اور دبنگ تھا، وہ ہر قیمت پر صاحباں کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور ہر طرح کے خطرے کو مول لینے کے لیے تیار تھا جب کہ رانجھا بزدل تھا کیونکہ ہیر اُس کو بھاگ جانے کا کہتی ہے تو وہ یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ عشق میں چوری یا بھاگ جانے کا مزا نہیں۔ رانجھے کی نسبت مرزا کی دلیری پنجاب کے نوجوان کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا پنجاب کے نوجوانوں کا آئیڈیل بن چکا ہے اور اس کو ساندل بار کا دولہا بھی کہا جاتا ہے۔

مرزا سیدھا صاحباں کے گاؤں پہنچتا ہے اور شادی والے گھر سے صاحباں کو لے کر نکل جاتا ہے۔ اس کی تیز رفتار گھوڑی بُکی اسے دور لے جاتی ہے، راستے میں مرزا آرام کی نیت سے قیام کر لیتا ہے۔ روایت ہے کہ چوں کہ جاٹ بہنوں کے معاملے میں بہت محتاط ہوتے ہیں، اس لیے وہ بہن کی رخصتی کے بعد گھر جانا چاہتا تھا، اس لیے ٹھہر جاتا ہے لیکن یہ قیام اس کی موت بن جاتا ہے۔ وہ ایک درخت کے نیچے سو جاتا ہے۔ صاحباں جب اس کے تیر دیکھتی ہے تو پریشان ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ مرزا ایک ماہر تیر انداز ہے اور اس کا نشانہ خطا نہیں جاتا وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرزا ان تیروں سے اس کے بھائیوں کو نشانہ بنائے۔ جب لڑائی شروع ہوتی ہے تو مرزا اپنے ٹوٹے ہوئے تیروں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے، اس کی منظر کشی پیلویوں کرتا ہے۔:

منداکیتوئی صاحباں، میر اترکش ٹنگی اوجنڈ

سر تو منڈاسا اڈ گیا گل وچ پیندی چنڈ

باجھ بھراواں جٹ ماریا کوئی نہ مرزے دے سنگ

ترجمہ:

اے صاحباں یہ تو نے اچھا نہیں کہ کہ میر اترکش درخت پر لٹکا دیا، مرزا کے سر سے پگڑی اتر گئی اور اس کے سر کے بال اس کے گلے میں پڑ گئے۔ جاٹ کو بغیر بھائیوں کے مارا کہ مرزا بالکل اکیلا تھا۔

صاحباں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے ناراض بھائیوں کو منا لے گی لیکن اس کے بھائیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور مرزا کو مار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مرتے دم بھی مرزا کے لبوں پر صاحباں کا نام تھا اور وہ صاحباں کی بے وفائی سے ہی مر گیا تھا۔ صاحباں کی موت کے بارے میں بھی متضاد روایات ہیں کہ وہ مرزا کو بچاتے ہوئے جان کی بازی ہار گئی جب کہ کچھ محققین کے مطابق کے اُس کے بھائی اسے واپس محل لا کر مار دیتے ہیں۔ یہ قصہ ہمیں سکھاتا ہے کہ محبت میں اعتماد اور فیصلہ سازی بہت ضروری ہے اور جذباتی و لحاتی فیصلے کبھی

کبھی نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قصہ غلط معاشرتی روایات اور خاندانی دباؤ کی تلخ حقیقت کو بھی عیاں کرتا ہے جو اکثر بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

4.4 سوہنی مہینوال:

قیاس کیا جاتا ہے کہ سوہنی مہینوال کا قصہ مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس رومانوی داستان کو بہت سے پنجابی شعرا نے منظوم کیا ہے لیکن سب سے زیادہ شہرت سید فضل شاہ نواں کوٹی کی داستان کو حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے گجرات میں ایک کمہار رہتا تھا جس کا نام تُلا گلگو تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جو نہایت حسین و جمیل تھی اور اسی وجہ سے "سوہنی" کے نام سے معروف تھی۔ ایک دفعہ ایک سوداگر "عزت بیگ" نے بخارا جاتے ہوئے گجرات میں قیام کیا۔ یہاں اس نے سوہنی کے حسن و جمال کے بے شمار قصے سنے تو اس کے دل میں نہ سوہنی کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ شوق دل میں لیے وہ تلا گلگو کی دکان پر جا پہنچا اور سوہنی کا حسن دیکھ کر اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ وہ روزانہ ان کی دکان پر جاتا اور مہنگے داموں برتن خرید کر سستے داموں فروخت کر دیتا۔ اسی طرح اس نے اپنی ساری دولت لٹا دی اور کنگال ہو گیا لیکن عشق کا بھوت ابھی بھی سر سے نہ اترا تھا اس لیے وہ تلے یعنی سوہنی کے گھر ملازم ہو جاتا ہے۔ سوہنی کو بھی عزت بیگ سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ بھی عشق میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنا شروع ہو جاتی ہے۔ ملاقات کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے تو سوہنی کی ماں کو بھی اس صورتحال کی خبر ہو جاتی ہے۔ وہ سوہنی کی شادی کر دیتی ہے عزت بیگ جو عشق میں مہینوال کے نام سے مشہور ہو گیا تھا، سوہنی کی جدائی میں فقیر بن کر دریا کے کنارے رہنے لگتا ہے۔ اب سوہنی مہینوال کی ملاقاتیں روزانہ رات کو دریا کے کنارے ہونے لگتی ہیں۔ پھر یہ معمول بن جاتا ہے کہ روزانہ مہینوال مچھلی کا شکار کرتا اور سوہنی کے لیے تازہ کباب بنا کر لاتا۔ ایک روز ایسا ہوتا ہے کہ مہینوال کے ہاتھ کوئی مچھلی نہیں آتی تو وہ پریشان ہوتا ہے کہ وہ سوہنی کو کیسے کباب کھلائے گا۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھتی ہے کہ وہ اپنی ران سے گوشت کاٹ کر کباب بناتا ہے اور زخمی حالت میں دریا پار کر کے سوہنی کے پاس پہنچتا ہے۔ سوہنی جب کباب کھاتی ہے تو اسے اس کا ذائقہ عجیب لگتا ہے جس کا وہ اظہار کرتی ہے۔ مہینوال اس کو راغب کرتا ہے کہ وہ مچھلی کا کباب کھائے لیکن سوہنی کہتی ہے کہ یہ حرام ہے اس میں انسانی گوشت کی باس ہے۔ ان کی بحث و تکرار لمبی ہو جاتی ہے۔ تو آخر مہینوال اسے اپنی ران دکھاتا ہے جہاں سے گوشت کاٹ کر کے اس نے کباب بنائے تھے تو سوہنی اس کا حال دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے اور کہتی ہے:

تیرے صدق یقین داسانوں ہویا پک

ڈیرے بیٹھ محمد اواڑ اساڈی تک

کرنی تیری دوستی خاصی پئی قبول
اگوں تدھ نہ آؤناں طرف اساڈی مول
بندی تدھول آوسی جان پیاری ہول
اینویں جاں محمد امیں بلبل توں پھول
اس تھیں پچھے زیاتوں نہ آویں چل
میں ہی اوتھے آوساں چیر اجاڑیں جھل
بولی طعنے خلق دے سب سرے تے جھل
جس دن رہی محمد اجانی پئی اجل
رخصت کیتوس یارنوں کر کے قول قرار
ہر گز تساں نہ آؤناندیوں لنگھ اورار

ترجمہ:

سوہنی کہتی ہے کہ مجھے یقین ہے کہ تمہارا عشق سچا ہے اور آج سے تم مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے، تم دریا کے کنارے پر ہی انتظار کروگے اور ہر حال میں خود تم سے ملنے آوں گی چاہے خلق خدا کچھ بھی کہے جب تک زندگی رہی میں ہی تم سے ملنے آؤں گی اُس نے یہ قول قرار کر کے محبوب کو رخصت کیا۔

چنانچہ اب سوہنی روزانہ گھڑے کے سہارے دریا پار کر کے مہینوال سے ملنے جاتی۔ سوہنی کے سسرال والوں کو اس پر شک ہو جاتا ہے اور ایک دن اس کی نند اس کا پیچھا کرتی ہے اور اسے دریا پار کرتے دیکھ لیتی ہے۔ اگلے دن وہ سوہنی کو سزا دینے کا منصوبہ بناتی ہے اور رات کے اندھیرے میں سوہنی کے پکے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیتی ہے تو سوہنی جب جانے کے لیے گھڑا اٹھاتی ہے تو اسے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے اور پکے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیا گیا ہے لیکن وہ واپسی کو توہینِ عشق کے مترادف خیال کرتی ہے۔ اس لیے اس نے کچے گھڑے کے ساتھ ہی دریا پار کرنے کا سوچا لیکن کچا گھڑا کیسے ساتھ دیتا، وہ پانی میں بہہ گیا اور سوہنی مہینوال کو پکارتے پکارتے دریائے چناب میں ڈوب جاتی ہے ادھر مہینوال جب سوہنی کی آواز سنتا ہے تو دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور ڈوب کر محبوب سے جا ملتا ہے۔

4.5 پورن بھگت:

پورن بھگت کا قصہ پنجابی میں بہت سے شعرا نے منظوم کیا ہے لیکن جو شہرت قادر یار کے قصہ ''پورن بھگت'' کو ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ داستان دیگر رومانوی داستانوں سے منفرد ہے، اس میں خیر اور

شر کی جنگ کو علامتی انداز میں ابھارا گیا ہے۔ قادر یار جو قصہ سناتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ سیالکوٹ کے راجے سلوان کی دو بیویاں تھیں ایک کا نام اچھراں تھا جو پورن کی سگی ماں تھی جب کہ دوسری راجہ سلوان سے عمر میں چھوٹی تھی اور اس کا نام لوناں تھا، وہ بے اولاد تھی جب پورن پیدا ہوا تو نجومیوں نے راجہ سلوان کو خبر دار کیا کہ وہ بارہ سال پورن کا منہ نہیں دیکھے اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ مر جائے گا۔ راجہ سلوان نے ڈرتے ہوئے بیٹے کو اپنے سے دور کر لیا۔ بارہ برس بعد پورن اپنے ماں باپ کو ملنے آتا ہے تو پورن کی سوتیلی ماں لوناں اس کی خوبصورتی اور وجاہت دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ وہ پورن کو حالِ دل سناتی ہے، اسے ورغلاتی ہے لیکن پورن اس کی بات نہیں مانتا۔ جب لوناں یہ دیکھتی ہے کہ پورن کسی طرح بھی اس کے دام میں نہیں پھنس رہا تو وہ پورن کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بناتی ہے اور جا کے راجہ سلوان سے شکایت کرتی ہے کہ پورن اس پر بری نظر رکھتا ہے۔ راجہ بغیر سوچے سمجھے اور تحقیق کئے پورن کے ہاتھ پاوں کٹوا کر اسے کنوئیں میں پھینک دینے کا حکم صادر کرتا ہے۔ بارہ برس بعد گورو گورکھ ناتھ کا گزر اس کنوئیں کے پاس سے ہوتا ہے جہاں پورن کو پھینکا گیا تھا۔ گرو گورکھ ناتھ پورن کو کنوئیں سے نکالتے ہیں اور اپنی کرامت سے اس کے ہاتھ پاؤں بھی واپس دلاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسے جوگ بھی بخش دیتے ہیں۔ اس موقع پر ایک اور رانی سندراں گرو کے آگے ہاتھ جوڑ کر پورن کے ساتھ کی خواہش کرتی ہے تو گرو پورن کو رانی سندراں کے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں لیکن پورن کچھ دنوں بعد واپس گرو کے پاس آجاتا ہے۔ سندراں اس کی جدائی برداشت نہیں کر پاتی اور محل سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ اب گرو پورن کو واپس اس کے ماں باپ کے پاس بھیج دیتا ہے۔ پورن محل میں آکر باغ میں ڈیرہ لگا لیتا ہے اور اس کی کرامات کے چرچے عام ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ رانی اچھراں جو بیٹے کی جدائی میں رو رو کر اندھی ہو چکی تھی پورن کے پاس آجاتی ہے۔ پورن اپنی ماں کو پہچان لیتا ہے لیکن اس کو بتاتا نہیں وہ دعا کرتا ہے، تو اس کی ماں کی بینائی واپس آجاتی ہے۔ رانی لوناں کو جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو وہ راجے کو لے کر پورن کے پاس آتی ہے اور اپنے کیے کی معافی مانگتی ہے۔ پورن اسے بھی معاف کر دیتا ہے اور اپنے باپ راجہ سلوان کو بھی۔ پورن چاول کے دانے پر کچھ پڑھ کر رانی لوناں کو دیتا جس سے اس کی گود ہری ہو جاتی ہے اور ایک بیٹا رسالو پیدا ہوتا ہے۔ راجہ سلوان پورن کی منتیں کرتا ہے کہ وہ محل آکر تخت و تاج سنبھالے لیکن پورن نہیں مانتا اور واپس اپنے گورو کے پاس آجاتا ہے۔

اس داستان میں پورن نیکی کی علامت ہے اور لوناں شر کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رانی لوناں حق کے راستے میں آنے والی بڑی آزمائش ہے جو دیگر کئی مشکلات کو جنم دیتی ہے اور یہ ایک ازلی حقیقت ہے کہ خیر و شر کی جنگ میں فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ پورن کا کنواں آج بھی سیالکوٹ میں موجود ہے

اور بہت سے بے اولاد جوڑے وہاں جا کر صاحب اولاد ہونے کی دُعا کرتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک اہم اخلاقی سبق یہ ہے کہ سچائی اور ثابت قدمی ہمیشہ کامیابی کا باعث بنتی ہے چاہے حالات کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں۔ پورن نے اپنے والد راجہ سلوان کے غیر منصفانہ سلوک اور اپنی سوتیلی ماں لوناں کی چال بازیوں کے باوجود راست بازی کا دامن نہیں چھوڑا جس سے ظاہر ہوا کہ حقیقی طاقت اور عزت ہمیشہ نیک نیتی، صبر اور ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔

خود آزمائی

1۔ پنجابی رومانوی داستانیں جہد مسلسل کا درس دیتی ہیں، بحث کیجیے۔

2۔ ہیر رانجھا کی داستان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

3۔ کیا آپ اتفاق کرتے ہیں کہ سوہنی مہینوال کی کہانی قربانی، وفا اور محبت کا عکس پیش کرتی ہے؟

4۔ کیا وجہ ہے کہ مرزا پنجاب کے نوجوان کا آئیڈیل ہے؟

5۔ پورن بھگت کی داستان خیر و شر کی جنگ ہے، اس کہانی کے حوالے سے ثابت کیجیے۔

یونٹ نمبر:5

دینی ادب

تحریر:ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی:ڈاکٹر عائشہ رحمٰن

فہرست

	یونٹ کا تعارف	80
	یونٹ کے مقاصد	80
5.1	پنجابی دینی ادب: تعارف	81
5.2	حمد	82
5.3	نعت	89
5.4	قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر	100
5.5	احادیثؐ کے تراجم	103
5.6	سیرتِ رسولؐ	103
	خود آزمائی	115

یونٹ کا تعارف

پنجابی زبان میں دینی ادب کا سفر صدیوں پر محیط ہے، جس نے پنجاب کے مذہبی اور روحانی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پنجابی زبان کی سادگی اور تاثیر نے اسلامی تعلیمات کو عوامی سطح پر پھیلانے کا ذریعہ فراہم کیا ہے۔ اس زبان میں لکھا گیا دینی ادب، جیسے حمد، نعت، قرآن پاک کے تراجم و تفاسیر، اور سیرتِ رسول ﷺ، لوگوں کے دلوں میں ایمان، محبت، اور عقیدت کو راسخ کرتا ہے۔ پنجابی زبان کے دینی ادب نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے عقیدت کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے، جسے پنجاب کے ہر طبقے نے دل سے قبول کیا ہے۔ یہ ادب نہ صرف دینی تعلیمات کو فروغ دیتا ہے بلکہ لوگوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت بھی کرتا ہے۔ پنجابی دینی ادب کی یہ روایت آج بھی زندہ ہے جس کے بارے میں آپ اس یونٹ میں خاطر خواہ معلومات حاصل کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ پنجابی زبان میں دینی ادب کی روایت سے روشناس ہو سکیں۔

2۔ پنجابی ادب میں حمد کی روایت بیان کر سکیں۔

3۔ پنجابی ادب میں نعت کی روایت پر روشنی ڈال سکیں۔

4۔ پنجابی زبان میں قرآن کے تراجم اور تفاسیر کی تفصیل بیان کر سکیں۔

5۔ پنجابی منثور و منظوم ادب میں سیرت رسولؐ کی روایت جان سکیں۔

دینی ادب

5.1 پنجابی دینی ادب: تعارف

جیسا کہ گزشتہ یونٹس میں بھی ذکر ہوا کہ پنجابی زبان و ادب کی پرورش بزرگان دین کے حجروں میں ہوئی۔ ان ہستیوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے عوامی زبان کو اپنایا۔ پنجابی ادب کی ابتدائی روایت میں اگرچہ چند نام بھگتی تحریک سے تعلق رکھنے والے شعرا کے آتے ہیں لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق پنجابی زبان و ادب کا موجودہ رنگ و روپ مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی میں دینی ادب کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ کلاسیکی پنجابی شاعری میں تواتر کے ساتھ مذہبی موضوعات ملتے ہیں۔ پنجابی شاعری میں اصناف کی بے تحاشا رنگارنگی ہے اور بہت سی موضوعاتی اصناف مذہب سے متعلقہ ہیں۔ چند اہم موضوعاتی اصناف جو دینی ہیں ان کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

گلزار:

''گلزار'' میں جنگ ناموں کی طرز پر انبیائے کرام کے حالات و واقعات بیان کیئے جاتے ہیں۔ مثلاً مولوی محمد مسلم (88-1805) کی گلزار محمدیؐ، گلزار موسیٰ، گلزار آدمؑ وغیرہ۔ مولوی محمد دلپذیر (1875) کی گلزار محمدی، گلزار موسیٰ، گلزار مکہ وغیرہ اہم گلزاریں ہیں۔

چوہر ہئیڑی نامہ:

اس میں شاعر اپنے آپ کو بھنگن (چوہڑی) تصور کر کے حضور اکرمؐ کے دربار میں اپنے دکھوں اور غموں کا بیان عاجزی اور انکساری کے ساتھ کرتا ہے۔ سید وارث شاہ کا چوہر ہئیڑی نامہ زیادہ مشہور ہے۔

جوگی نامہ:

اس میں شاعر اپنے آپ کو جوگی تصور کر کے محبوب حقیقی کے وصال کی خواہش کرتا ہے۔

نور نامہ اور میلاد نامہ:

نور نامہ میں رسول کریم حضرت محمدؐ کی ولادت یا سعادت کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ جب کہ میلاد نامے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق واقعات، معجزات کا بیان ہوتا ہے۔ قادر یار کا لکھا ہوا نور نامہ زیادہ مشہور ہے۔

معراج نامہ: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں حضرت محمدؐ کے واقعہ معراج کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ قادر یار کا لکھا ہوا معراج نامہ لوگوں میں بہت مشہور ہوا۔

حلیہ شریفؐ:

حلیہ شریفؐ میں حضورؐ کے حلیہ مبارک کو بیان کیا جاتا ہے۔ مولوی غلام رسول، مولوی خادم علی اور بی بی مخفی نے حلیہ شریفؐ لکھے۔

اشترنامہ:

اشترنامہ میں شاعر اپنے آپ کو اونٹ کی مانند تصور کر کے رسول کریمؐ پر آنے والی مشکلات کو بیان کرتا ہے۔ سید وارث شاہ اور شاہ شرف کے اشترنامے مشہور ہیں۔

جھوک:

اس صنف سخن میں شاعر ان تکالیف کا ذکر کرتا ہے۔ جو مدینہ منورہ کے سفر کے دوران ذوق و شوق سے برداشت کرتا ہے۔ سید غلام مصطفیٰ اور موسیٰ لدھیانوی کی جھوک مشہور ہے۔ مذہبی اور دینی جھوک کے علاوہ عشقیہ جھوکیں بھی لکھی گئیں۔

اس کے علاوہ سیرت النبی کے موضوع پر منظوم اور منثور تخلیقات بھی منظر عام پر آتی ہیں۔

مرثیہ:

مرثیہ ایسی نظم ہوتی ہے جس میں کسی مرنے والے کی تعریف کی جاتی ہے لیکن پاکستانی زبانوں میں اس کو کربلا کے واقعات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔

اس مختصر ترین جائزے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی شاعری میں ابتدائی دور سے ہی حمدیہ و نعتیہ رنگ غالب رہا ہے۔ اس کے بعد آنے والوں شعرا نے بھی اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی تخلیقات کے آغاز میں حمد اور نعت شامل کی ہے۔ حتیٰ کہ بعض غیر مسلم شعرا بھی اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جدید دور میں بھی اس روایت کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ پنجابی ادب کی نثر کی ابتدا بھی مذہبی موضوعات سے ہوتی ہے۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے مواعظ کو پنجابی نثر کا پہلا نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کی جو نثری کتب اب تک بازیافت کی جا چکی ہیں، وہ سب فقہی و شرعی مسائل پر لکھی گئیں ہیں۔ ان میں حافظ برخوردار رانجھا کی مفتاح الفقہ، مولوی عبدالکریم جھنگوی کی نجات المومنین، پکی روٹی وغیرہ اہم ہیں۔ ایک طرف یہ سرسری جائزہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ پنجابی ادب میں دینی ادب کی بھرپور روایت موجود ہے تو دوسری طرف پاکستان مذہب اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔ اس لیے پنجابی دینی ادب کے ذخیرے میں روز بروز خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔

5.2 حمد:

پنجابی زبان و ادب کا بیشتر حصہ اسلامی دور کی پیداوار ہے اور اس وجہ سے پنجابی شاعری میں حمدیہ عناصر بھرپور انداز سے ملتے ہیں۔ بابا فرید گنج شکرؒ کو پنجابی کا پہلا باقاعدہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں حمدیہ عناصر اصلاحی و تبلیغی مقاصد کے تحت ملتے ہیں:

فرید اخالق خلق مانہہ، خلق وسے رب مانہہ
مند اکس نوں آکھیئے جاں تس بن کوئی نانہہ

ترجمہ:

اے فرید، خالق مخلوق میں بستا ہے اور مخلوق خالق میں، اب برا کس کو کہیں کہ تیرے (رب) بغیر کہیں کچھ نہیں۔

اس کے بعد سکھ مذہب کے بانی گرو نانک کے ہاں بھی حمدیہ مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ مغلیہ دور (1526-1857) جو کہ خاصا طویل ہے، اس میں پنجاب کی دھرتی نے بہت سے عظیم بزرگان دین و پنجابی شعرا کو جنم دیا جنھوں نے اپنے کلام سے پنجابی شاعری کو ثروت مند بنا دیا۔ اس ابتدائی دور میں شاہ حسین اور سلطان باہوؒ جیسے بڑے صوفی آتے ہیں۔ ان کی شاعری تصوف کے مضامین سے بھری پڑی ہے۔ یہ صوفیا کرام محبوب حقیقی کے وصال کی تڑپ کے جاگزیں لمحوں کو جب شعروں میں پروتے ہیں تو متصوفانہ رنگ میں حمدیہ مضامین کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ نظر آتا ہے۔ مثلاً شاہ حسین کی ایک مختصر کافی میں عشق حقیقی کا بیان ان الفاظ میں ملتا ہے۔

آکھ نی مائے، آکھ نی، میرا حال سائیں اگے آکھ نی
پریم دے دھاگے انتر لاگے، سُولاں سیتی ماس نی
انج جنیندے بھولیے مائے جن کرلا یو پاپ نی
کہے حسین فقیر نمانا، جاند امولا آپ نی

ترجمہ:

اے میری ماں کہہ دے کہہ میرے دل کا حال سائیں سے کہہ دے، پریم کے دھاگے سے میرا جسم سیا جا چکا ہے۔ جننے والی بھولی ماں تو نے جنم دے کر گناہ کیا، پاپ کمایا۔ حسین فقیر بے چارہ کہتا ہے کہ رب کی ذات سب جانتی ہے۔

اس کے علاوہ اس دور کے دیگر شعرا دمودر، پیلو، حافظ برخوردار، احمد گجر، نوشہ گنج بخش، مولوی عبداللہ، علی حیدر ملتانی، بلھے شاہ، وارث شاہ، خواجہ فرد فقیر، مولوی لطف علی بہاولپوری غرض یہ کہ اس دور

کے ہر شاعر کے ہاں حمدیہ مضامین کا ایک سلسلہ ملتا ہے۔ وارث شاہ اپنی لازوال مثنوی ''ہیر'' کا آغاز ان اشعار سے کرتے ہیں:

اول حمد خدا اور دیجئے عشق کیتا سُوجگ دا مُول میاں
پہلے آپ ہی رب نے عشق کیتا تے معشوق ہے نبی رسولؐ میاں
عشق پیر فقیر دا مرتبہ ہے، مرد عشق دا بھلا رنجول میاں
کھلے تنہاں دے باغ قلوب اندر جنہاں کیتا ہے عشق قبول میاں

ترجمہ:

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کہ اسی ذات پاک نے تمام جہانوں کی تخلیق کے لیے عشق کو بنیاد بنایا۔ حضرت محمدؐ کو اپنا معشوق قرار دیا۔ عشق کی بدولت پیر فقیر کے مقام و مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہی عشق بیماری میں سکون کا باعث بنتا ہے۔ وہ نیک لوگ جنہوں نے مذہب عشق قبول کیا، ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے راحت و سکون کے باغ کِھلا دیے ہیں۔

اس کے بعد کا دور جسے سکھی دور بھی کہا جاتا ہے اس میں ہاشم شاہ، احمد یار مرالوی، منشی غلام حسن گامن اور پیر محمد وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان سب شعرا کے ہاں بھی حمدیہ مضامین ملتے ہیں۔

انگریزی دور کے اہم شعرا میں سید فضل شاہ نواں کوٹی، میاں محمد بخش، مولوی غلام رسول عالمپوری، میاں محمد بوٹا، میاں ہدایت اللہ اور خواجہ غلام فرید جیسے نام شامل ہیں۔ میاں محمد بخش جنہیں شاعر اخلاق بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی سفر العشق، معروف بہ سیف الموک سے چند حمدیہ اشعار کا ترجمہ یوں ہے:

اول حمد خداوند تائیں، جو خلقت دا سائیں
نابود و جس بود بنایا، ہر اک صورت تائیں
آپ کریگر خواہش کر کے اربع عناصر گوئی
ترے قسماں پیدائش اوس تھیں رنگ برنگی ہوئی

ترجمہ:

سب سے پہلے خُدا کی تعریف کریں جو اس کائنات کا مالک ہے اور جس نے اس کائنات میں موجود ہر چیز کو جو پہلے سے کوئی وجود نہیں رکھتی تھی اُسے وجود اور جسم دیا۔ اللہ تعالیٰ کے دل میں جب اس دنیا کو پیدا کرنے کی خواہش نے جنم لیا تو اس نے آگ، پانی، مٹی اور ہوا کو آپس میں ملا دیا اور اچھی طرح سے گوند کر نباتات، جمادات اور حیوانات کو تخلیق کیا۔

انگریزی دور میں بھی پنجابی شعرا کے ہاں اس روایت کا تسلسل جاری و ساری رہا۔ پنجابی کے پہلے صاحب دیوان شاعر مولا بخش کشتہ اپنے دیوان کا آغاز ان حمدیہ اشعار سے کرتے ہیں:

پہلے عشق دا چمکیا نور ربی فیر عشق تھیں کل جہان ہویا
ہویا عشق دے نال پھر رشک پیدا خوشی نال غم دا سامان ہویا

ترجمہ:

پہلے عشق ربی کا نور چمکا اور پھر اس نور سے کل جہاں پیدا ہوا۔ گویا خوشی کے ساتھ غم کا سامان کر دیا گیا اور عشق کے ساتھ رشک کو لازم کر دیا گیا۔

انگریزی دور میں پیر فضل گجراتی، حکیم عبد اللطیف عارف، فیروز دین شرف، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، استاد دامن، حکیم شیر محمد ناصر اور دائم اقبال دائم کے علاوہ بے شمار ایسے شعرا ہیں جنہوں نے باقاعدہ حمد لکھی یا حمدیہ مضامین کو اپنی تخلیقات کے ذریعے امر کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد البتہ حمد کی ترقی و ترویج تیزی سے ہوئی۔ اس دور میں بہت سے حمدیہ مجموعے منظر عام پر آنے لگے۔ کچھ مجموعات ہیں جن میں حمد و نعت کو ایک تناسب سے شامل کیا گیا ہے۔ حمد کو صنف سخن کے طور پر خصوصی توجہ 1980ء کے بعد حاصل ہوئی جب الگ سے حمدیہ مجموعات تیزی سے چھپنے لگے جن میں سے چند اہم حمدیہ مجموعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

''اللہ تعالیٰ دے نڑنویں ناں'' قاضی نذر مولا کا بیس صفحات پر مشتمل کتابچہ ہے جو کہ ''کلیات نذر مولا'' کے آغاز میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں شاعر نے اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں اور ان ناموں سے متعلق صفات کے حوالے سے اپنی عقیدت کے جوہر دکھائے ہیں اور اسی حوالے سے صفت باری تعالیٰ بیان کی ہے۔ قاضی صاحب کی کلیات میں شامل دیگر تصنیفات میں بھی حمد کے نمونے ہیں، ان کی حمد کا نمونہ پیش ہے:

اول آخر ظاہر باطن ہے، ہو سی بر حق اللہ

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

''بہشتی چلے'' منشی غلام حسین کا مرتب کردہ انتخاب ہے جو کہ ان کی اپنی ہی مختلف کتب میں سے حمد، نعت اور مناقب کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ منشی غلام حسین کی یہ کاش ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوئی۔

''سی حرفی امر'' محمد دین وصف کی تخلیق ہے جس میں محمد دین وصف نے لفظ امر ہر مصرع میں کہیں ایک بار اور کہیں ایک سے زیادہ بار بڑے اچھوتے انداز میں برتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے نہ صرف شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ لفظ بھی موتی کی طرح جگمگا اٹھتا ہے۔ یہ سی حرفی احسان اللہ طاہر کی تلاش اور جستجو کے نتیجہ میں منظر عام پر آئی جو کہ بعد میں وصف کے دوسرے کلام کے ساتھ شائع بھی ہو چکی ہے۔
ان کی حمد کا نمونہ ملاحظہ کریں:

الف امر نہ امر دی کھیڈ ہے سی آہی ذات اکو کبریا پہلے
امر نال نوروں نور جدا ہو کے بنیا نور احمد مصطفٰے پہلے
ملی بانگ الست دی جدوں امروں کہیا نور اس قالو بلٰی پہلے
وصف امر تھیں قلم دوٹک ہو کے لکھیا لوح اوپر لا الہٰ پہلے

ترجمہ:

نہ امر تھا نہ امر کا کھیل تھا، ذات کبریا پہلے اکیلی تھی۔ امر (ربی) سے نور، نور سے جدا ہوا اور اور مصطفٰےؐ بنا۔ جب خدا نے ''الست بربکم'' پکارا تو سب سے پہلے اسی نور نے قالو بلٰی کہا۔ وصف وہ امر ہی تھا جس کے حکم سے قلم نے عرش پر لا الہٰ لکھا۔

''ربنا'' تنویر بخاری کا کتابچہ ہے جس میں انھوں نے ایک درمند پاکستان کی دلی دعا نظم کی ہے۔ اس کتاب کا انداز بھی دعا کی طرح ہے جس میں تعریف اور ثنا کی بجائے حاجات کے بیان پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز باقاعدہ حمد باری سے کیا گیا ہے اور پاکستان کی ترقی کا خواب بڑے اچھوتے انداز میں دکھایا گیا ہے۔ جس میں ملی درد اور وطنیت بھی ہے اور فکر و فن بھی۔

''واگاں میں دل موڑ'' ابولامتیاز ع س مسلم کی قابل قدر تصنیف ہے۔ اردو اور پنجابی شعری روایت میں یہ ایک اچھوتا تجربہ ہے۔ اس کتاب میں ہر خیال قرآن اور حدیث کے دلائل اور حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلے حصہ حمد پر مشتمل ہے، دوسرے حصے میں نعت جبکہ تیسرے میں دیگر منظومات شامل کی گئی ہیں۔ اس کتاب سے حمد کا نمونہ پیش ہے!

اک ثنا میں رب دی لکھاں لکھ لکھاں سر نانواں ہو
دل دے اندر اس دیاں ثناناں دا سومیلا لانواں ہو
ہر شے دے وچ اس دے جلوے کی کی میں گنوانوں ہو

اکھیوں اوہلے پر رگ رگ وچ بولے اس دانانواں ہو

ترجمہ:

اللہ کی ثنا لکھوں تو اس پر لاکھوں عنوان لکھتا ہو ان اس طرح میں اپنے دل میں اس کی یادوں کا میلہ لگا لیتا ہوں۔ مجھے اس کے جلوے ہر شے میں نظر آتے ہیں اور وہ اس کثرت سے ہوتے کہ گنوا نہیں سکتا۔ وہ آنکھوں سے تو اوجھل ہے مگر ہر رگ میں اس کا نام گونج رہا ہے۔

''حمد چراغ دلاں دا چانن'' محمد اقبال نجمی کا لکھا ہوا حمدیہ مجموعہ ہے۔ کتاب کی رو سے یہ پنجابی ادب کا پہلا حمدیہ مجموعہ ہے۔ اس میں تقریباً تمام اصناف شاعری میں حمد لکھی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ہائیکو میں بھی حمد کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ان کے فن کے حوالے سے حفیظ تائب لکھتے ہیں کہ انھوں نے حمدیہ شاعری کو ایک اچھوتا، اونچا اور خالص فن بنا دیا ہے۔ ان کی حمد کا ایک نمونہ پیش ہے:

ہر شے جہدے کہن تے چلے اوہ ہے اللہ سوہنا
جہدی مرضی روکے ٹھلے اوہ ہے اللہ سوہنا
جہڑا دل دیاں نیتاں جانے سوچ تے غلبہ جہدا
جہڑا ہر تھاں اوپر تھلے اوہ ہے اللہ سوہنا
نور دلاں نوں جہڑا بخشے، اکھاں نوں ٹھنڈک دیوے
جہڑا پیار ہواواں گھلے اوہ ہے اللہ سوہنا

ترجمہ:

جس کے حکم سے ہر شے چلتی ہے وہ اللہ سوہنا ہے جس کی مرضی انسان کو اپنے ارادوں سے روکتی ہے۔ وہ اللہ سوہنا ہے جو دلوں کے بھید جانتا ہے اور سوچ پر بھی غالب ہے جو اوپر نیچے ہر جگہ موجود ہے وہ اللہ سوہنا ہے جو دلوں کو نور بخشتا ہے۔ ٹھنڈک دیتا ہے وہ اللہ سوہنا ہے۔

احسان اللہ طاہر کے حمدیہ مجموعہ ''سائیں میریا تیری جگنی'' کو حمدیہ ادب کا ایک رجحان ساز سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں لوک گیتوں کی سی چاشنی موجود ہے اور کہیں بے باقی اور بے ادبی کا گذر بھی نہیں ہوا۔ اس کتاب میں ایک جگہ اللہ کے ننانوے ناموں کو بڑے دل نشین انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

کوئی وی کفروں پاک نہ ہوے پاک رزق نہ کھاوے
جد تیکر اوہ طاہر سوہنا القدوس نہ چاہوے
ویری لکھ واری پیا بھاویں آقتلام مچاوے

اوہنوں کیہڑا مارے جنہوں السلام بچاوے

ترجمہ:

کوئی بھی اس وقت تک نہ کفر سے پاک ہو سکتا ہے اور نہ پاک رزق کھا سکتا ہے جب تک وہ سوہنا سائیں، القدوس اور طاہر نہ چاہے۔ بے شک دشمن لاکھ بار آکر قتل عام مچادے مگر اسے کوئی نہیں مار سکتا جسے السلام یعنی سلامتی دینے ولا بچانا چاہے۔

''حمد یہ سی حرفی ''منیر صابری کنجاہی کی لکھی ہوئی ایک سی حرفی ہے جو کی ۵۶ صفحات پر مشتمل کتابچے کی شکل میں شائع ہوئی۔ ۳۲ بندوں پر مشتمل یہ سی حرفی حمد کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہے البتہ اس کو بھی کتاب کے دائرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس سی حرفی کے پہلے بند کا ترجمہ دیکھیں:

ترجمہ:

الف اللہ کی تعریف میں اس لیے کرتا ہوں کہ یہ تعریف میرے نبیؐ نے بھی کی اور علیؓ نے بھی کی۔ چاری یاروں نے گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں اس کی تعریف کی، انکار کرنے والوں نے بھی دل میں اس کی تعریف ضرور کی، اولیانے کی اور غوث حلی نے بھی کی منیر اس کی تعریف ہر تنے نے کی، ہر پھول نے کی اور ہر کلی نے کی۔

''حرف نذرانے ''مقصود احمد شرقپوری کا ترتیب دیا ہوا ۱۲۲ صفحات پر مشتمل شعری انتخاب ہے جس میں پنجابی شعرا کا کلام شامل ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۶ میں مقصود پبلشرز لاہور نے شائع کی۔

''توحیدی چالی نظماں'' کے عنوان سے لکھی ہوئی یہ کتاب چالی توحیدی قصوں پر مشتمل مجموعہ ہے جو محمد اسماعیل سفری نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں لوگوں کے عقائد کی اصلاح کے لیے لکھے۔ ان منظوم قصوں میں عقیدہ توحید کی وضاحت قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں کی گئی ہے۔ لوگوں میں رائج غلط عقائد کو دلائل سے رد کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے عقیدہ توحید و رسالت کی تفہیم کی ایک کاوش پیش ہے جو ان کی ماہیت اور اسلوب کا بہتر ادراک دلا سکتی ہے۔ وہ اپنے قصے ''توحیدی قصہ ناشکرا مسلمان'' میں عقیدہِ توحید و رسالت کا بیان کچھ اس طرح کرتے ہیں:

ہُندے دونے جز اسلام اندر پہلا جز خدا نوں خدا منّا
سدا چلدے رہنا توحید اتے نہ کوئی ہور خدا سوا منّاں
منّا ایک خدا دی ذات تائیں لا شریک وچ دونویں سرا منّا
اس نوں شرک آکھن بدلے نال جیہڑا ہور شریک بنا منّاں

دو جا جز ہے پاک رسول تائیں اپنا پیر منا پیشوا منناں
سدا سنت نبیؐ تے عمل کرنا نبی پاک تائیں رہنما منناں
ایس گل تائیں بدعت آکھدے تے سنت نال کوئی رسم ملا منناں
ہندے دونے جز اسلام اندر رب جدا رسول جدا منناں

ترجمہ:

اسلام کے دو جز ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے اور توحید پر ہمیشہ کاربند رہا ہے اور توحید یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو (معبود) نہ مانا جائے۔ اللہ کی ذات کو ایک مانا جائے اور دونوں جہانوں میں اسے لاشریک جانا جائے۔ اسے شرک کہتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک مانا جائے۔ اسلام کا دوسرا جز ور سول پاکؐ کو اپنا پیر اور پیشوا ماننا ہے۔ سدا سنت نبوی پر عمل پیرا ہونا اور آپؐ کو اپنا رہبر پیش ماننا ہے۔ اس بات کو بدعت کہتے ہیں کہ سنت نبویؐ کے ساتھ کوئی رسم ملائی جائے۔ اسلام میں دو جزو ہوتے ہیں یعنی اللہ کو الگ ماننا اور نبیؐ کو الگ ماننا۔

ان چند ناموں کے علاوہ جدید پنجابی ادب میں شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن کی حمد فکر و فن کے حوالے سے نہ صرف اعلیٰ معیار کی ہے بلکہ روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے جو دلوں کو جلا بخشتی ہے مگر یہاں سب کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب حمد نگاروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے معاشرے کے ہر معاملے اور مذہب کے ہر مسئلے کے تناظر میں عقیدہ توحید اور حمد باری تعالیٰ کی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں جس سے حمد کی بے پناہ وسعتوں کا ایک نیا جہان جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ساری بحث کو ایک پیرائے میں سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ صوفی شعرا کے کلام میں جدید عناصر تصوف کے رنگ سے مزین ہیں جب کہ مثنوی نگار شعرا نے حمد میں ذکر، شکر، فکر، تسبیح و تہلیل اور قادر مطلق کی قدرت کو بڑے سلیس اور ماہرانہ انداز میں منظوم کیا ہے۔ پنجابی ادب میں دیوان یا مجموعات کا آغاز حمد سے کرنے کا رجحان بڑا مضبوط ہے کیوں کہ یہ حصول برکت و ثواب کے لیے ہوتی تھیں۔ موجودہ دور میں حمد نے بطور صنف شاعری خاصی ترقی کی ہے یعنی ادب یہ صرف روایت کی پیروی نہیں رہی بلکہ آج اس کے الگ سے مجموعات شائع ہو رہے ہیں۔

5.3 نعت:

نعت ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس میں نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ کی تعریف کی جائے، ان کی خوبیاں اور سیرت بیان کی جائے۔ جیسا کہ اس یونٹ کے پچھلے صفحات میں ذکر ہوا کہ پنجابی شاعری کی بہت سی اصناف ایسی ہیں جن میں آپؐ کی ذات اقدس کے مختلف پہلوؤں پر بات کی جاتی ہے۔ جیسا کہ نور نامہ، میلاد نامہ، معراج نامہ

اور جھوک وغیرہ۔ اس کے علاوہ کلاسیکی پنجابی شاعری میں چوں کہ تصوف کی بھرپور روایت موجود ہے اور صوفی آپؐ کی ذات سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں کیونکہ تصوف عشق رسولؐ کے بغیر ممکن نہیں شاعر اس لیے ان کے کلام میں نعتیہ اشعار جابجا ملتے ہیں۔ تصوف کی راہ میں فنافی الرسول ایک اہم منزل ہے جو عشق رسولؐ کے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ پنجابی شعری صوفی روایت میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان کی سی حرفیوں میں عشق رسولؐ کی جھلک ملاحظہ کریں۔

ب بسم اللہ اسم اللہ دا ایہ گہناوی بھاری ہُو
نال شفاعت سرور چھُٹ سی عالم سارا ہُو
حدوں ودھ درود نبی نوں جس دا ایڈ پسارا ہُو
میں قربان تنہاں توں باہو جنہاں ملیا نبیؐ سہارا ہُو

ترجمہ:

بسم اللہ کا زیور بھاری ہے آپؐ کی شفاعت کی بدولت سارے جہاں کی بخشش ہو گی۔ نبی پاکؐ پر درود پڑھا جائے گا جو بخشوا دے گا۔ میں ان لوگوں پر قربان ہو جاؤں جنہیں نبی پاکؐ کا سہارا نصیب ہوا۔

اس شعری روایت میں اٹھارہویں صدی کے دو عظیم پنجابی شعرا بلھے شاہ اور وارث شاہ کے کلام میں نعت رسول مقبولؐ کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ بلھے شاہؒ کے کلام سے ایک مثال دیکھیں:

ک کلام نبی دی سچی نبیاں دے سائیں
صورت پاک نبی دی جہیا چن سورج بھی ناہیں
ہیرے موتی لعل جواہر پہنچے اوتھے ناہیں
مجلس اوس نبی دی بہہ کے بُلھا کون کہاوے

ترجمہ:

نبی پاکؐ کا کلام سچا ہے جو نبیوں کا سردار ہے۔ آپؐ کی صورت مبارک کی طرح تو چاند سورج بھی نہیں، ہیرے، لعل موتی اور جواہر کی چمک بھی آپؐ کی صورت مبارکؐ کے سامنے کچھ نہیں۔ جب نبی پاکؐ کی مجلس میں بیٹھوں تو کوئی بلھا نہیں کہے گا۔

ہیر جیسی لازوال تخلیق کے خالق سید وارث شاہ اپنے کلام میں کئی مقامات پر ہدیہ نعت پیش کرتے ہیں۔

جنھاں بندیاں دا مرشد پیر کامل سردار ہے کل پیغمبراں دا
ہادی مسجداں تے آتش خانیاں دا، ٹھاکر دواریاں، گرجیاں، مندراں دا

ترجمہ:

سارے نبیوں کا سردار جن کا مرشد اور پیر کامل ہے۔ وہ یعنی حضرت محمدؐ مساجد، آتش خانوں، گردواروں، گرجاگھروں اور مندروں کو ہدایت دینے والا ہے۔

اسی طرح ہمیں کلاسیکی روایت کے دیگر شعرا جن میں مولوی غلام رسول عالمپوری، میاں محمد بخش، محمد بوٹا گجراتی، خواجہ غلام فرید وغیرہ شامل ہیں کے کلام نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔

انگریزی دور میں پیر مہر علی شاہ گولڑوی کی پنجابی نعت بے مثال ہے۔ اگرچہ پیر صاحب کی تصنیفات و تالیفات اردو اور فارسی زبان میں ہیں لیکن انہوں نے ہدیہ نعت پنجابی زبان میں پیش کیا ہے:

جان آکھاں کہ جان جہاں آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان توں شاناں سب بنیاں
سبحان اللہ ما اجملک ما احسنک ما اکملک
کتھے مہر علی، کتھے تیری ثناء
گستاخ اکھیاں کتھے جالڑیاں

ترجمہ:

جان کہوں یا جہان کہوں سچ کہوں اور رب کی شان بیان کروں آپؐ کی شان سے سب کیشان بنی ہے سبحان اللہ ما اجملک ما احسنک ما اکملک، کہاں مہر علی کہاں تمہارا تعریف کرنا تمہاری گستاخ آنکھیں کہاں بھڑ گئیں۔

اسی دور کے رجحان ساز شاعر راقب قصوری کا نام نعت کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ ان سے پہلے نعت محض مثنویوں، جنگ ناموں، داستانوں یا قصوں کے شروع میں لکھی جاتی تھی۔ راقب قصوری نے پہلی بار نعت کو ایک الگ صنف سخن کے طور پر متعارف کیا اور کئی نعتیہ مجموعے پیش کیے جن میں "حضرت محمدؐ دی حضوری، مولا دی منظوری، مدینے پاک دی چوری، دیوان راقب اور راقب قصوری دیاں نعتاں" شامل ہیں۔ راقب قصوری کی نعت میں رسول کریمؐ کے روضہ مبارک پر حاضری دینے کی خواہش بڑی مچلتی ہے اور وہ مدینے کی یاد میں تڑپتے رہتے ہیں:

برہوں جلیاں، لاٹاں بلیلاں، گلیاں گلیاں کوکدی
بوہڑ سائیاں، کہیاں سائیاں، سانوں لوڑاں تیریاں

توں پیارا، توں دلارا، توں سہارا خلق دا
سینے لائیں، ہُن کدائیں، عرضاں عُرضاں میریاں

ترجمہ:

جدائی کی آگ میں جل رہا ہوں اور گلی گلی میں پکارتا پھر رہا ہوں، اے سائیاں (حضرت محمدؐ) ہمیں تمہاری ضرورت ہے، توں یعنی آپؐ پیارے ہیں، دلارے ہیں اور خلقت کا سہارا ہیں۔ کبھی تو میری عرض کو سینے سے لگائیں (یعنی مدینہ پاک حاضری کی دُعا قبول فرمائیں)

پہلے صاحب دیوان شاعر مولا بخش کشتہ کی نعت بھی جذبہ عشق رسول سے لبریز ہے وہ لکھتے ہیں:

تیرے خلق دیاں دھماں ہیں تھاں تھاں تیرے پرچم دا ہے جگ وچ چرچا
نعت تیری کیہ لکھے ناچیز کشتہ ثناخواں آپ یزدان تیرا

ترجمہ:

آپؐ کے اخلاق کی شہرت ہر جگہ ہے، آپؐ کے پرچم کا چرچا سارے زمانے میں ہے۔ کشتہ جیسا ناچیز بندہ آپؐ کی نعت کیا لکھے جب اللہ تعالی آپؐ کی تعریف کر رہا ہے۔

جدید پنجابی غزل کے حوالے سے پیر فضل گجراتی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پیر صاحب نے غزل کے ساتھ ساتھ نعت بھی اعلیٰ پائے کی لکھی۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ جناب حفیظ تائب صاحب نے "قطبی تارا" کے نام سے مرتب کیا۔ ان کی نعت میں عشق رسولؐ اور وصال رسولؐ کی تڑپ قابل دید ہے:

بالو ریت تتی تتی ہیٹھ کنڈاں، گرم گرم پتھر اپر چھاتیاں دے
اوہدے عشق وچ عاشقاں صادقاں تے ساڑ لئے حُشے کمخواب ورگے
اجے ہیں کجھ ہجر دے سال باقی اجے دور نیں ساعتاں وصل دیاں
اجے فضل تیرے کچے اتھرو نیں، اجے ہوئے نیں سرخ عناب ورگے

ترجمہ:

پشت کے پیچھے ریت جلاؤ اور چھاتیوں کے اوپر گرم گرم پتھر رکھ دو۔ آپؐ کے عشق میں سچے عاشقوں نے اپنے کمخواب یعنی نرم و نازک بدن جھلسا لیے۔ ابھی جدائی کے کچھ سال باقی ہیں، ابھی وصل یعنی ملنے کے لمحات دور ہیں۔ ابھی فضل کے آنسو کچے ہیں اور سرخ نہیں ہوئے مراد ابھی عشق رسولؐ میں کچھ کمی ہے اور آنسو خون کے نہیں۔

بابائے پنجابی کا لقب پانے والے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ وہ ویسے بھی مذہبی انسان تھے، انہوں نے نعت میں اپنے آپ کو حسان بن ثابت کا ہم خیال ثابت کیا:

ہے میریاں حمداں نعتاں توں بہت اتانہہ مقام محمدؐ دا
پیا اپنے شعر سجاناں میں وچ لکھ کے نام محمدؐ دا

ترجمہ:

میری نعتوں کے مقابلے میں آپؐ کا مقام بہت بلند ہے۔ میں اپنے اشعار کو محمدؐ کا نام لکھ کر سجا رہا ہوں۔

حفیظ تائب کی شخصیات کی بہت سی جہات ہیں لیکن ان کا سب سے معتبر حوالہ نعت ہے۔ انہوں نے پنجابی اور اردو میں نعت کا بے بیش بہا ذخیرہ تخلیق کیا ہے۔ ان کی نعت کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ عشق نبیؐ ان کی رگ رگ میں خون کی طرح سمایا ہوا تھا اور درِ نبیؐ پر حاضری کی تڑپ سے ان کا دل مخمور تھا:

کدی نہ دور تیرے در توں ہووا ں
تڑپ میری مولا ودھا ہور
درود آقاؐ تے پڑھدیاں ہویاں جان ہاراں
ناں رکھاں دل دے اندر کوئی چاء ہور
نبی دے در تے ٹٹے ساہ دی ڈوری
کوئی حسرت نہیں ایہدے سوا ہور

ترجمہ: آپؐ کے در سے کبھی دور نہ ہوں اے میرے مولا میری تڑپ اتنی بڑھا دے کہ میرے دل کے اندر کوئی اور خواہش باقی نہ رہے۔ نبیؐ کے در پر میرا دم نکلے، اس کے سوا میری کوئی اور حسرت نہیں۔

حفیظ تائب کے پہلے پنجابی مجموعہ نعت کا نام "سک متراں دی" ہے جو پیر مہر علی شاہ کی مشہور زمانہ نعت سے مستعار ہے:

اج سک متراں دی ودھیری اے
کیوں جندڑی اداس گھنیری اے

ترجمہ:

آج محبوب سے ملنے کی تڑپ بہت ہے۔ آج زندگی بہت اداس ہے۔

سک سے مراد کوئی ایسی زبردست خواہش جو حسرت کا روپ دھار کر انسان کے من کو کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ متر پنجابی میں محبوب کو کہا جاتا ہے یعنی محبوب ہستی حضرت محمدؐ کا عشق، محبوبؐ حقیقی کو پانے کی

حسرت، انہیں دیکھنے اور ملنے کی حسرت اور ہجر کے لمحوں کی اذیت کو حفیظ تائب نے اس نعتیہ مجموعے میں سمویا ہے اور اسی لیے اس مجموعے کا نام "سک متراں دی" رکھا ہے۔ یوں تو ان کے اردو زبان میں بھی نعتیہ مجموعہ جات شائع ہو چکے ہیں لیکن پنجابی میں ان کا دوسرا مجموعہ "لیکھ" کے نام سے شائع ہوا، جس میں انہوں نے مختلف اصناف سخن کے علاوہ نعت بھی لکھی ہے۔ ان کی نعت کے بارے میں حافظ لدھیانوی کہتے ہیں:

"حفیظ تائب نے حاضری کے بعد جو نعتیں کہیں ان میں وصال کی لذت،
قرب کی خوشبو، مشاہدے کا حسن اور حضورؐ کے لمحاتکا سرور نظر آتا ہے
نعت کا آہنگ لہجے اور اظہار بیان میں اور روضہ شریف پر آنسوؤں میں بھیگی
ہوئی دُعاؤں کا ذکر نعت میں اک حسین اضافہ ہوا ہے"

اس ضمن میں ان کی ایک نعت سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

کاسے اکھیاں دے لے کے آ گئے نیں
لین دید داخیر فقیر درتے
ٹور سائلاں نوں کھڑے ہن جیہڑے
تیرے در دی پکڑ زنجیر درتے
مارے ہوئے جدائی دے صدمیاں دے
آئے ہوئے سخت دلگیر درتے
مکھ ویکھ نہیں لین گے جدوں توڑی
کھڑے رہن گے تیرے اسیر درتے

ترجمہ:

آپؐ سے مخاطب ہو کر حفیظ تائب کہتے ہیں کہ آنکھوں کا کشکول لے کر آپؐ کے دیدار کو سائل کھڑے ہیں اور آپؐ کے در کی زنجیر پکڑ کر تب تک کھڑے رہیں گے جب تک آپؐ دیدار کرا کر رُخصت نہیں کریں گے۔ یہ جُدائی کے مارے ہوئے ہیں اور آپؐ کا چہرہ مبارک دیکھنے تک یہ اسیر ادھر ہی کھڑے رہیں گے۔

حفیظ تائب کے ہمعصر پنجابی شعرا میں محمد اعظم چشتی، حافظ محمد حسین، حافظ صائم چشتی اور محمد علی ظہوری قصوری کی نعتیہ شاعری مشہور ہے۔ یوں تو ہر مسلمان حضرت محمدؐ کی تعریف و توصیف کرتا ہے لیکن ان شعرا نے آپؐ کی ذات وصفات سے عشق کو زندگی کا نصب العین بنالیا۔ محمد علی ظہوری قصوری کی نعت کا نمونہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آپؐ کی ذات اقدس سے بے تحاشا عقیدت رکھتے تھے:

جس راہ توں سوہنیا لنگھ جاویں اوہدی خاک اٹھا کے چُم لیناں
جد ہجر ستاوے، ناں تیرا اکھیاں نوں لا کے چُم لیناں
اک دن اوہ دن وی آوے گا جد درتے یار بلاوے گا
رکھ رکھ کے تصور روضے دا اک نقشہ بنا کے چُم لیناں
میر امان ظہوری سوہنے تے میں کو ہجا کیہ تعریف کراں
جو قلم لکھے ناں سوہنے دا، اوہ قلم اٹھا کے چم لیناں

ترجمہ:

جس راستے وہ سوہنا گزر جاتا ہے، اس راہ کی خاک اٹھا کے چوم لیتا ہوں۔ جب ہجر تنگ کرتا ہے تو آپؐ کا نام لکھ کر آنکھوں کو لگا کر چوم لیتا ہوں۔ ایک دن وہ دن بھی آئے گا جب آپؐ اپنے در پر بلائیں گے۔ تصور میں روضے مبارکؐ کا نقشہ بنا کر چوم لیتا ہوں۔ میں بدصور تا آپؐ کی کیا تعریف کروں، میں آپؐ پر مان کرتا ہوں۔ جس قلم سے آپؐ کا نام لکھا جاتا ہے اسے اٹھا کر چوم لیتا ہوں۔

محمد اعظم چشتی کے نعتیہ مجموعہ جات ''اُنیندرے، نیئر اعظم، غذائے روح اور رنگ و بو'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ صائم چشتی کے نعتیہ مجموعہ حیات ''صائم دے دوہڑے، نوائے صارم چار حصے، نور دا ظہور، نور دے خزینے، جلوے اور نظارے'' کے نام سے چھپ کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اعظم چشتی کی نعت میں جابجا حضرت محمدؐ کی ولادت باسعادت اور کرامات کا ذکر جھلکتا ہے:

کون آیا اج دنیا اتے ہوئیاں گلی گلی روشنائیاں
ابراہیمی گلشن اندراج عجب بہاراں آئیاں
جس نوں حاصل کرن دی خاطر پیاں مکے وچ دہائیاں
اعظم لعل حلیمہ لے گئی، ہتھ ملدیاں رہ گئیاں دائیاں

ترجمہ:

یہ دنیا میں کس کی پیدائش ہوئی ہے کہ ہر گلی روشن ہو گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے گلشن کے اندر عجیب بہار آئی ہے کہ جس کو حاصل کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں شور مچ گیا ہے اور یہ قیمتی لعل دائی حلیمہ لے گئی باقی ہاتھ ملتے رہ گئے۔

حافظ محمد حسین حافظ کے نعتیہ کلام کے کئی مجموعات شائع ہوئے ہیں جن میں "پیام جبرائیل، جام نور، نور دی بارش، حضور دی حضوری، حبیب اعظم، جام سرور، سرور ای سرور، مستاں دا کعبہ" وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ وہ اپنی ایک نعت میں آمدِ رسولؐ یوں بیان کرتے ہیں:

چن عرب چڑھیا مکے دی زمیں اندر
سب فلک دے چن تارے ہوون لئی فدا آئے
جیہدے نام وچ چھپیاں لکھاں ای شفاواں نیں
حافظ دیاں دکھاں دی اوہ بن کے دوا آئے

ترجمہ:

عرب میں مکے کی سرزمین میں چاند نمودار ہوا اور آسمان کے چاند ستارے اُس چاند پر قربان ہونے کے لیے آئے جس کے نام میں لاکھ شفا ہے، وہ حافظ (تخلص) کے دکھوں کی دُعا بن کر تشریف لائے ہیں۔

غلام مصطفیٰ بسمل کی پنجابی ادبی خدمات کو بہت سے زاویوں سے پرکھا جا سکتا ہے لیکن ان کا ایک معتبر حوالہ نعت ہے۔ رسول پاکؐ کے عشق کو وہ زندگی کی معراج خیال کرتے ہیں۔ ان کی نعت میں ہمیں نورانیت مصطفیٰؐ، یادِ مدینہ، تمنائے حضوری، ذکر نبیؐ کی برکات کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے مسائل کے حل کی فریاد جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے دونوں مجموعہ نعت "اکھر اکھر نعت اور ساہواں دی تلاوت" میں پُر نور اور پر سوز لے پورے تسلسل سے عشق رسالت مآبؐ میں ڈوبی ہوئی کیف آور اور روح پرور بن کر رواں دواں ہے۔ مضامین کے حوالے سے وہ معیاری اور اچھوتے موضوعات کی حامل نعتیں تخلیق کرتے رہے ہیں۔ ان کی یہ خوبصورت نعت اس بات کی دلیل ہے:

آپؐ دے مڑھکے دی خوشبوئی خبراں دیوے
لنگھے نیں سرکارؐ دلارے رحمت رحمت
جدوی لکھی نعت نبی سرورؐ دی
آپے اوہناں حرف اتارے رحمت رحمت
جتھے وی دہرائے جاندے درس نبیؐ دے
اج وی ذیشان ادارے رحمت رحمت

ترجمہ:

آپؐ کے پسینے کی خوشبو خبر دے رہی ہے کہ اس راستے سے رحمت اللعالمینؐ کا گزر ہوا ہے۔ جب نبیؐ کی نعت لکھی تو آپؐ نے نعت کے حرف نازل کیے۔ جہاں بھی آپؐ کا درس دہرایا جاتا ہے وہ ادارے عظیم الشان ہیں اور اُن پر رحمت برستی ہے۔

بسمل صاحب نے 1980ء میں "سیدی یارسول اللہ" کے نام سے جو مجموعہ نعت شائع کیا اس میں ساری نعتیں یارسول اللہ کی ردیف لیے ہوئے ہیں۔ امین خیال کی نعت شریف میں سوز، مستی، عشق اور تڑپ موجود ہے۔ وہ نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ کی سیرت کے ساتھ ساتھ ان کی من موہنی صورت کا خاکہ بھی بناتے ہیں اور روز آخرت آپؐ کی شفاعت کے طلب گار بھی ہیں۔

تساں دے اک اشارے نال سورج پرت آوندا اے
تہاڈی ٹھوکر اں وچ نیں ستارے یارسول اللہ
گناہاں دی سفارش لئی تہاڈی آس کافی اے
کراں کیہ ہور ایدوں ودھکے چارے یارسول اللہ
تہاڈے مونہوں اقوال پھلاں وانگ کر دے رہے
اوہ اج تک سانجھی پھر دے نیں پھلیرے یارسول اللہ

ترجمہ:

آپؐ کے اشارے سے سورج واپس اپنی جگہ پر آجاتا ہے آپؐ کے قدموں میں ستارے ہیں اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے آپؐ کی سفارش کافی ہے، اس سے بڑھ کے اور کیا کروں کہ اے رسول اللہ آپؐ کے منہ سے جو اقوال پھولوں کی مانند گرے وہ آج تک پھولوں والے سنبھالے ہوئے ہیں۔

نعت لکھنے والوں میں ایک اور اہم نام اقبال نجمی کا ہے جن کا نعتیہ کلام "سک دی ڈالی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے نام سے جھلکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی دلی سک (حسرت) تڑپ اور درد فراق کو پیش کرتے ہیں:

جو یاد اچ تہاڈی آن اتھرو
رحمت دے ہڑھ وگدے نیں شہر نبیؐ دے اندر
اوہ ڈاہڈا رنگ لیان اتھرو
ہر رنگ دے پھل کھڑ دے نیں شہر نبیؐ دے اندر

دل چاہوے اڈ کے جا پہنچاں
درس ہدایت لبھدا اے او تھوں سجنا تائیں
نہ پیش چلے ڈگ جان اتھرو
نس نس لوکی جاندے نیں شہر نبی دے اندر

ترجمہ:

آپؐ کی یاد میں جو آنسو بہتے ہیں وہ ایسے ہیں جیسے رحمت کا دریا نبیؐ کے شہر میں بہتا ہے وہ آنسو جو آپؐ کی یاد میں بہتے ہیں۔ ہر رنگ کے پھول شہر نبیؐ کے اندر کھلتے ہیں دل چاہتا ہے کہ اُڑ کر وہاں پہنچ جاؤں جہاں سے ہدایت کا درس ملتا ہے مگر بس نہیں چلتا اور آنسو بہتے ہیں کہ لوگ بھاگ بھاگ کر شہر نبیؐ جاتے ہیں۔

راجا رشید محمود کا نعتیہ مجموعہ کلام ''نعتاں دی اٹی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نئی نعت لکھنے والوں میں محمد اکرم رضا کا نام قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی حیات توصیف مصطفیٰؐ کے لیے وقف کر دی ہے۔ ان کی نعت میں ہجر کی تڑپ اور گہرا سوز ہے اور صوتی آہنگ بلا کا ہے۔ نعت لکھنے کے لیے باطن کی پاکیزگی، طہارت نفس اور جس لگن و عشق کی ضرورت ہوتی ہے وہ اکرم رضا کے پاس ہے۔

دل دی راحت جان دی چاہت صورت کملی والے دی
کرے اجالا دو جگ اندر سیرت کملی والے دی
باجھ نبیؐ دے کون سہارا دیوے دکھاں ماریاں نوں
بیڑے پار لگائے سبھ دے رحمت کملی والے دی

ترجمہ:

آپؐ کی صورت مبارک دل کی راحت اور چاہت ہے آپؐ کی سیرت دونوں جہانوں میں اُجالا کرتی ہے۔ دکھیاروں کو کون نبیؐ کے سوا سہارا دے۔ آپؐ کی ذات سب کے بیڑے پار لگانے والی ہے۔

ڈاکٹر حفیظ احمد کے اب تک نعتیہ مجموعات شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجوعہ ''نعتاں دا محل'' دیوان ہے جب کہ ان کا تیسرا نعتیہ مجموعہ گلشن نعت دا سوہنا پھل'' ہے جو انہوں نے پنجابی لوک صنف ماہیا کے روپ میں تحریر کیا ہے۔ ان کی چوتھی نعتیہ کتاب بھی ماہیوں پر مشتمل ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں جذبوں کی شدت، عقیدت کی فراوانی اور انمول موضوعات ملتے ہیں۔ وہ عشق رسولؐ میں پوری طرح مبتلا ہو کر نعتیہ اشعار تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی نعت میں اسلامی تاریخ کی جھلک بھی ملتی ہے اور آپؐ کی ذات سے جڑی ہر ساعت، ہر لمحے کا تذکرہ بھی مثلاً

قبا دھرت وچ جدوں اساری پہلی پاک مسیت
گارا مٹی، اٹاں ڈھوئیاں سب نال مل کے آپؐ

ترجمہ:

جب مسجدِ قبا اسلام کی پہلی مسجد تعمیر کی گئی تو آپؐ نے گارا، مٹی اور اینٹیں سب کے ساتھ مل کر اُٹھائیں۔

ایک جگہ پر آپؐ کی خطابت کے بارے میں لکھتے ہیں:

کوئی وی مثل تہاڈے خطبے دا ہو نہیں سکدے
جو وی لکھے جگ وچ مقالے طیبہ والیاؐ

ترجمہ:

آپؐ کے خطبے کے بارے میں جو بھی مقالہ جات تحریر کیے گئے وہ آپؐ کے خطبات کی مانند نہیں ہو سکتے۔

کچھ غیر مسلم شعرا نے بھی حضرت محمدؐ کی شان میں نعت کہی جیسا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی اردو نعت کے اشعار ہیں:

نام لیوا ہیں محمد کے پرستار تو ہیں
یعنی مجبور احمد مختار تو ہیں
عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پر اجارہ تو نہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی کی اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ صرف مسلم کا محمدؐ پر اجاراہ تو نہیں کیونکہ آپؐ کو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ اسی لیے دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے شعرا نے بھی آپؐ کی عقیدت میں نعتیہ کلام لکھا ہے۔ سکھ مذہب کے بانی گرو نانک لکھتے ہیں:

محمدؐ من توں من کتاباں چار
من خدائے رسول اندر سچا ای دربار

ترجمہ: آپؐ کو نبیؐ آخر الزمان مانو اور چاروں کتابوں پر ایمان لے آؤ اور یہ تسلیم کرو کہ رسول اللہ ﷺ کے دربار میں سچ ہی سچ ہے۔

اس کے علاوہ پنجابی زبان میں غیر مسلم نعتیہ کلام لکھنے والے شعرا میں جگن ناتھ سرشار، سردار بوشن سنگھ، جیکل بھگوان داس، ملکھی رام، سالک رام، پیارے لال وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

اوپر دیئے گے ان شعرا کے علاوہ جدید ترین دور میں گلشن نعت کی آبیاری کرنے والوں میں محمد یوسف گلینہ، محمد سلیم آسی، ناد جاجوی، اکرم سعید، صدیق تاثیر، مسلم اویسی، فقیر قادری، شوکت علی قمر، بشیر حسین ناظم، کرم حیدری، بشیر منذر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ آج کی نعت فنی و فکری لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ آج یہ محض مدح سرائی نہیں رہی بلکہ آپؐ کی سیرت مبارکؐ کو مد نظر رکھتے ہوئے عصر حاضر کے مسائل حل کرنے کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور اسلامی تاریخ کے مختلف مقامات پر آپؐ کی حیات طیبہ سے رہنمائی کے اشارے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسوہ حسنہؐ میں ہر عمر، ہر دور اور ہر علاقے کے لوگوں کے لیے جو مینارہ نور پنہاں ہے اس کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نعت رسول مقبولؐ صرف صنف سخن نہیں بلکہ موضوع سُخن کا درجہ پا گئی ہے۔

5.4 قرآن مجید کے تراجم اور تفسیر:

712ء میں محمد بن قاسم سندھ کے راستے برصغیر داخل ہوا تو اس کے ساتھ آنے والے عرب حضرات کی بدولت یہاں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ 1206ء میں قطب الدین ایبک نے یہاں پہلی باقاعدہ اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی جو کسی نہ کسی طرح مغلیہ حکومت کے زوال 1857ء تک جاری رہی۔ یہ مغلیہ عہد ہی تھا جس میں اسلام برصغیر کے کونے کونے تک جا پہنچا۔ مغلوں کی زبان فارسی تھی اس لیے قرآن پاک کے تراجم اور تفاسیر فارسی زبان میں لکھے جانے لگے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی پہلے مقامی بزرگ تھے جنہوں نے 1150 ہجری میں قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کے تقریباً پچپن (55) سال بعد ان کے بیٹے شاہ رفیع الدین نے "موضح القرآن" کے نام سے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان فارسی اور اردو تراجم سے پہلے پنجابی زبان میں قرآن پاک کے تراجم کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق حافظ برخوردار نے نواب جعفر کے کہنے پر سورہ یوسف کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا تھا۔ ترجمہ کرنا ویسے بھی مشکل کام ہے اور پھر مقدس کتب کے تراجم اور اُس پر مستزاد منظوم تراجم کرنا لیکن یہ ان بزرگان دین کی دلی عقیدت تھی کہ وہ اس مشکل کام کو انتہائی محبت سے سرانجام دیتے رہے۔ اس لیے پنجابی زبان میں قرآن پاک کے تراجم اور تفاسیر لکھی جاتی رہیں۔ ذیل میں قرآن پاک کے مکمل تراجم اور تفاسیر کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

تفسیر محمدیؐ کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ حافظ محمد ابن بارک اللہ نے 1296ھ کے لگ بھگ کیا۔ یہ ترجمہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ آیات مبارکہ کا ترجمہ منثور ہے جب کہ تفسیر منظوم صورت میں دی گئی

ہے۔ اس کے لیے آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کی سات جلدیں ہیں یعنی ہر منزل کے لیے الگ جلد۔ اس کے علاوہ ہر جلد کے شروع یا آخر میں ایک فہرست دی گئی ہے جو اشاریے کا کام کرتی ہے۔ جس سے قاری اپنے مطلوبہ موضوع کے ترجمے اور تفسیر تک بآسانی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں پنجابی کے ساتھ ساتھ فارسی ترجمہ بھی دیا گیا ہے اور اس کے بعد منظوم تفسیر دی گئی ہے۔

''تفسیر نبویؐ'' قرآن پاک کا دوسرا ترجمہ ہے جس کے ترجمہ نگار مولوی نبی بخش حلوائی ہیں۔ مولوی صاحب نے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا پھر پنجابی زبان میں نظم کیا اور آخر میں منظوم تفسیر لکھی، تفسیر لکھتے ہوئے کئی مقامات پر وضاحت کے لیے حواشی بھی دی گئی ہے۔ اس کی زبان بھی سادہ اور رواں ہے۔ عبد اللہ چکڑالوی صاحب کے قرآن پاک کے ترجمہ میں ابہام پایا جاتا ہے۔ کچھ محققین کے مطابق حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمے کو پنجابی کاروپ کتاب کے ناشر میاں محمد چٹو نے دیا ہے کیوں کہ اس ترجمے کا نام محمد چٹو ہے لیکن 1901ء میں شائع ہونے والا قرآن پاک کا یہ ایک معیاری ترجمہ ہے۔

مولوی حبیب اللہ کمبوہ کا پنجابی ترجمہ تفسیر نعمانی کے نام سے مشہور ہے۔ تفسیر امینی کے نام سے مولانا عمر بخش درویشی نے قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھی ہے۔ لیکن اس کے پہلے پانچ حصے بیسویں صدی کے شروع میں شائع ہوئے جب کہ باقی ابھی تک اشاعت سے محروم ہیں۔ اس ترجمے کی عمدہ خوبی یہ کہ یہ نظم اور نثر دونوں صورتوں میں کیا گیا ہے۔ مولوی فیروز دین ڈسکوی نے تفسیر فیروزی کے نام سے ترجمہ اور تفسیر لکھی لیکن یہ مکمل ترجمہ اور تفسیر نایاب ہے۔ ابھی تک اس کے پہلے چار اور آخری دو پاروں کے تراجم اور تفاسیر بازیافت کی جا سکیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کا مکمل ترجمہ اور تفسیر لکھی ہو گی۔ اس ترجمے اور تفسیر کی زبان صاف ستھری اور علمی ہونے کے باوجود عام فہم ہے جس سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے۔

علامہ محمد علی فائق نے قرآن پاک کی ہر آیت کو پنجابی شعر کی شکل دی ہے۔ انہوں نے عربی متن درج نہیں کیا محض آیت نمبر لکھ کے ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم ترجمہ محمد اسلم جالندھری کا ہے جو منظوم ہے۔ قرآن پاک کے پنجابی نثری تراجم میں سب سے معروف ترجمہ مولوی ہدایت اللہ کا ہے جو 1305ھ میں مکمل ہوا اور 1389ھ میں پنجابی ادبی لیگ نے اسے شائع کیا۔ اس کے شروع میں سجدوں کی فہرست، اعراب، سات منازل اور رموز و اوقاف کے بارے میں اہم معلومات دی گئی ہیں۔ مولوی صاحب کا یہ ترجمہ ایک شاہکار ہے۔ انہوں نے عربی الفاظ کی درست روح کو پنجابی کے جن متبادل الفاظ میں ڈھالا ہے وہ انہی کا خاصا ہے۔ مثلاً الحمد اللہ رب العلمین کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

ترجمہ: سب سوہبا اللہ دی اے جو پالن والا سارے جگ دا

(اردو) سب تعریف اللہ کے لیے جو سب کا پالنے والا ہے۔

پنجابی چونکہ کہ دور سم الخطوں میں لکھی جاتی ہے۔ فارسی رسم الخط جسے شاہ مکھی بھی کہا جاتا ہے اور گر مکھی رسم الخط۔ گر مکھی رسم الخط میں قرآن پاک کا پنجابی ترجمہ محمد یوسف خاں نے کیا جو قادیان، گورداسپور سے شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ دیال سنگھ لائبریری میں موجود ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ کچھ سکھ حضرات نے بھی قرآن کریم کا پنجابی ترجمہ کیا ہے۔ جن میں زیادہ معروف گوردت سنگھ کا پنجابی ترجمہ ہے جو گر مکھی رسم الخط میں 1921ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے یہ ترجمہ مسلمان علماء کو دکھایا اور اس کے مستند اور معیاری ہونے کی تصدیق کی۔ تصدیق کرنے والے علماء میں سید علی عباس شاہ، سید میر حسن شاہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر برکت علی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

پنجابی زبان کے مختلف لہجوں میں بھی قرآن پاک کے تراجم کیے گئے ہیں جن میں محترمہ بخت آور کا ترجمہ اور تفسیر جو کہ سرائیکی لہجے میں ہے، ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ محمد شریف شاد نے پوٹھوہاری میں قرآن پاک کا مکمل ترجمہ کیا ہے۔ قرآن پاک کے بہت سے تراجم اور تفاسیر ایسی ہیں جو کہ نامکمل ہیں کچھ تو سورہ شریف کے تراجم ہیں اور کچھ چند پاروں کے تراجم اور تفاسیر ہیں۔ مولوی دلپذیر بھیروی نے کچھ پاروں کا نثری ترجمہ کیا ہے اور پھر منظوم تفسیر دی ہے۔

قصص المحسنین کے نام سے مولوی عبدالستار صاحب نے سورہ یوسف کا منظوم ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی ہے۔ ان کی تفسیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تفسیر لکھتے ہوئے مستند راویوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ مولوی حبیب اللہ کی حبیب التفسیر معروف بہ تفسیر نعمانی 9 پاروں پر مشتمل ہے، اس منظوم ترجمہ اور تفسیر کے لیے بڑے بہترین الفاظ کا چناؤ کیا گیا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ اس ترجمہ اور تفسیر پر حاشیہ اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ قرآن پاک کے پہلے پارے کا ترجمہ مستری قمرالدین نے کیا جو نثر میں ہے اور پھر تحت اللفظ میں۔ مولوی نبی بخش حلوائی کا ایک اور تجربہ 4.5 پاروں پر مشتمل ہے جس کا نام انتخاب التفاسیر ہے۔ یہ ترجمہ اردو اور پنجابی نثر ہے کچھ ایسے تراجم و تفاسیر بھی ہیں جو کسی خاص واقعہ یا موضوع کو سامنے رکھ کر کیے گئے ہیں جیسا کہ مولوی فیروز دین ڈسکوی نے سورہ مریم کی تفسیر تحریر کی۔ تفسیر یوسف کے نام سے سورہ یوسف کی تفسیر لکھی جس میں قرآن پاک سے مستعار واقعات ہی مدِ نظر رکھے ہیں۔

سورہ الضحیٰ کا ترجمہ اور تفسیر مولوی عبدالستار نے اکرام محمدی کے نام سے تحریر کیا۔ اسی نام یعنی اکرام محمدی کے نام سے ہی مولوی دلپذیر بھیروی نے سورہ الضحیٰ اور سورہ الکوثر کا پنجابی ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ سورہ

الرحمٰن کا اردو اور پنجابی ترجمہ مولوی نورالدین نے کیا جس میں انہوں نے ان کی تفسیر کو نظم کیا۔ اسی سورہ کی ایک تفسیر مولوی فضل الدین نے لکھی۔ انہوں نے پہلے مشکل الفاظ کے معنی لکھے پھر ترجمہ اور تفسیر تحریر کی۔ بعض علماء نے صرف مخصوص سورتوں کے تراجم کیے جیسے باغِ بہشت عرف ''پنج گنج دلپذیر'' میں سورہ الواقعہ، سورہ نوح، سورہ عم، سورہ یٰسین اور سورہ الملک کا پنجابی ترجمہ مولوی دلپذیر بھیروی نے کیا۔ اسی نام سے مولوی غلام قادر نے سورہ یوسف، مزمل، نوح، رحمٰن اور الملک کا اردو نثر میں ترجمہ کیا جب کہ پنجابی میں منظوم ترجمہ تحریر کیا۔ محمد علی بھجنا نے سورہ المزمل کا پنجابی میں منظوم ترجمہ کیا۔

یہ وہ تراجم اور تفاسیر ہیں جو کہ شائع ہو کر عوام الناس کے سامنے آ گئے اس کے علاوہ بہت سے تراجم اور تفاسیر یقیناً اشاعت سے محروم ہوں گی۔ قرآن پاک کے تراجم اور تفاسیر کی ضرورت و اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے اور علما کرام نے ہر عہد میں اس ذمہ داری سے عہد برآں ہونے کی سعی کی ہے۔ بہت سے تراجم اور تفاسیر مخطوطات کی صورت میں ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر مناسب تحقیق کر کے ان کو شائع کیا جائے تا کہ اس سرمائے سے عوام الناس استفادہ کر سکے۔

5.5 احادیث رسولؐ کے تراجم:

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پنجابی ادب میں نعت اور سیرت رسولؐ کی بھرپور روایت موجود ہے لیکن احادیثِ رسولؐ کے تراجم کی روایت اتنی قوی نہیں ہے، تاہم خان محمد نے ''چونویاں حدیثاں'' (منتخب احادیث) کے نام سے مختلف احادیث کو مرتب کیا ہے اور سرائیکی میں ان کا ترجمہ کیا ہے۔ 71 صفحات کی اس کتاب میں احادیث کے اوپر احکاماتِ نبویؐ کے عنوانات درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً نیت اور عمل، توحید، اللہ کی محبت، قرآن حکیم اسلام کی بنیاد، نماز کی شرائط وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ دلشاد کلانچوی نے چالیس منتخب احادیث کا سرائیکی میں ترجمہ اور تشریح ''چالیہ حدیثاں'' (چالیس احادیث) کے نام سے کیا ہے۔ 88 صفحات کی یہ کتاب 1975 میں سرائیکی لائبریری بہاولپور نے شائع کی۔ ان احادیث میں انہوں نے روزِ قیامت پیش آنے والے حالات کے متعلقہ احادیث کو شامل کیا ہے اور جن میں مسلمان کی نشانی، منافق کی نشانیاں، اللہ پر توکل اور حقوق العباد کے متعلقہ احادیث شامل ہیں۔

5.6 سیرتِ رسولؐ:

پنجابی زبان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر ابتدا سے ہی گہرے اسلامی اثرات نظر آتے ہیں۔ پنجابی لوک ادب ہو، شاعری ہو یا نثر، ہر دور میں اسلامی رنگ اور خصوصاً نعتیہ ادب اور سیرت نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ پنجابی لوک شاعری کی صنف میں سیرت نگاری کا نمونہ ملاحظہ کریں:

دن چڑھیا بھاگی بھریا
میرا نبیؐ مکے وچ وڑیا
اوہنے وڑ دے کلمہ پڑھیا
پڑھو لا الہٰ الا اللہ
محمدؐ پاک رسول اللہ

ترجمہ:

خوش قسمت دن آیا، میرا نبیؐ مکہ مکرمہ میں تشریف لایا اُس نے یہاں داخل ہوتے ہوئے کلمہ پڑھا، پڑھو لا الہٰ الا اللہ، محمدؐ پاک رسول اللہ

لوک صنف ڈھولا میں سیرت پاکؐ کا ایک حوالہ یوں ملتا ہے:

الف اللہ نوں کراں یاد ہمیشہ مینوں آسرے ہیں مولا پاک دے
اوہ کون مٹاندا جہیڑے لکھے نیں روز میثاق دے
نبیؐ پیار کیتا جیس بھارے چائے مخلوق دے

ترجمہ:

اللہ کو یاد کرتا ہوں کہ ہمیشہ مجھے اُسی ذاتِ باری کا آسرا ہے، جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُسے کوئی نہیں مٹا سکتا ہے۔ نبی پاکؐ مخلوق کے غم اپنے اوپر برداشت کیے ہیں۔

غرض یہ کہ پنجابی لوک شاعری میں سیرت پاکؐ کے مختلف پہلوؤں کو کئی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ بات اگر شاعری کی ہو تو پنجابی کلاسیکی عہد سے لے کر آج تک ہر دور میں ایسے شاعر سامنے آتے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں عشق رسولؐ اور سیرت پاک کو بیان کیا ہے۔ پنجابی صوفی شعرا نے اللہ تعالیٰ اور رسول پاکؐ کے عشق کو زندگی کا مقصد بنایا تھا اور اسی عشق کا اظہار انہوں نے شاعری کے ذریعے کیا۔ 462ھ میں اسماعیلی عقیدے کے اٹھارویں امام سیدنا مستنصر باللہ نے اپنے مخصوص انداز میں حضرت محمدؐ کی تعلیمات کی تبلیغ کی۔ ان کے بعد اسماعیلی پیروں نے جو شاعری کی اسے گنان کہا جاتا ہے۔ اس میں نبیؐ آخر الزمان حضرت محمدؐ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ پنجابی کی اپنی اصناف میں نبیؐ کی سراپا نگاری اور ان کی حیات کے مختلف واقعات کا ذکر ملتا

ہے۔ پنجابی کے نعت گو شعرا نے اپنے کلام میں آپؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو بڑی عقیدت سے بیان کیا ہے۔

پنجابی زبان میں سکھ مذہب کے بانی بابا گرو نانک کو آپؐ کی مدح کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کے بعد شاہ حسین لاہوری نے نعت لکھی لیکن پنجابی ادب کے محققین ان کو ابتدائی سیرت نگار تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ نعت گوئی اور سیرت نگاری مختلف چیزیں ہیں۔ شاہ حسین کے بعد مولوی عبداللہ لاہوری ایسی شخصیت ہیں جن کے دور سائل میں سیرت نگاری کے حوالے ملتے ہیں۔ ان کے رسالے "نص فرائض" (1032ھ) میں آپؐ کی ولادت باسعادت اور واقعہ معراج کا ذکر ملتا ہے۔

سلطان باہوؒ، بلھے شاہ، وارث شاہؒ، مولوی غلام رسول عالمپوری، خواجہ غلام فرید اور میاں محمد بخش تک سب کلاسیکی شعرا کے ہاں عشق رسولؐ کا رنگ جلوہ گر ہوتا ہے لیکن ان کو سیرت نگاری قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم عبداللہ لاہوری کے بعد حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے "معراج نامہ" لکھا، پھر حافظ برخوردار نے رسالہ "انواع" میں حضرت محمدؐ کے ننانوے ناموں کی تفصیل بیان کی ہے، اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور رسالہ "حکایت پاک نبیؐ" کے نام سے تحریر کیا۔

حامد شاہ عباسی نے 1782ء میں "اخبار حامد" نام کی کتاب تحریر کی جس میں انہوں نے حضرت محمدؐ کی ذات اقدس کی خوبیوں کی تفصیل لکھی ہے اور حیات طیبہ بھی بیان کی ہے۔ صدیق لالی نے اپنی دو کتب "چہل حدیث" اور صدق نامہؐ میں رسول پاکؐ کے بچپن، شادی، اولاد اور غزوات کی تفصیل لکھی ہے۔ مولوی احمد یار مرالوی نے 1274ھ میں حضرت محمدؐ کی حیات کے حوالے سے "معراج نامہ" اور "وفات نامہ" تحریر کیا۔ 1260ھ میں سید فضل شاہ نواں کوٹی نے بھی واقعہ معراج کو نظم کیا۔ 1281ھ میں میاں محمد بخش نے "تحفہ رسولیہ" لکھی جس میں آپؐ کی حیات مبارکہ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں آپؐ کی شفقت، رحمدلی، معجزات کا بیان اور شق القمر کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ مولوی محمد مسلم کی منظوم کتاب "گلزار محمدیؐ" 1281ھ میں تحریر کی گئی۔ حبیب اللہ لکھوی نے سیرت کی کتاب "معجزات حبیب اللہ" کے نام سے منظوم کی۔ 1290ھ میں مولوی غلام رسول عادل گڑھی نے "شارقہ الانوار" لکھی۔ مولانا غلام احمد وسیر "وضع اطوار محمدی" تحریر کی۔ اس کتاب کو لکھنے کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اُن کو خواب میں دیدار مصطفیٰ نصیب ہوا اور آپؐ کے حکم پر انہوں نے سیرت کی یہ کتاب رقم کی۔ مولوی عبدالستار نے اکرام محمدیؐ کے نام سے سورۃ والضحیٰ کی تفسیر لکھی جس میں سیرت مبارکہؐ کے بارے میں ایک باب بھی شامل کیا گیا ہے۔

مولوی روشن دین نے "باغیچہ محمدیؐ، ہجرت محمدیؐ، فضائل محمدیؐ اور شان محمدیؐ نام کے رسائل میں سیرت پاکؐ کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ گجرات کے معروف شاعر محمد رمضان گجراتی کے کہنے پر محمد بوٹا گجراتی نے "وفات نامہ سرورِ کائناتؐ" لکھی۔ 1326ھ میں غلام فرید عارف نے "حلیہ مبارکؐ" میں آپؐ کے حلیہ شریف کی تعریف کی ہے۔ مولوی غلام محمد کلاموری صاحب نے "گلزاری احمدی" تحریر کی جو فارسی کی مشہور کتاب "معارج النبوت" کا پنجابی ترجمہ ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

جے دریا جہان دے ہوون سیاہی سب
لکھن لگے اوس نوں ساری خلقت رب
لکھدے تھکن اوس نوں سُکن سب دریا
تاں بھی صفت محمدیؐ لکھن وچ نہ آ

ترجمہ:

اگر دنیا کے سب دریا سیاہی کے ہوں اور رب کی ساری مخلوق حضرت محمدؐ کی تعریف لکھے اور ساری خلقت تھک جائے، دریا خشک ہو جائیں تب بھی آپؐ کی صفات بیان نہ ہو سکیں۔

مولوی محمد الدین نے 1310ھ میں "تواریخ اسلام" میں آپؐ کی سیرت پر ایک باب رقم کیا ہے۔ تاہم مولوی ازہر بھیروی کی کتاب "گلزار محمدی" تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلی جلد میں آپؐ کی پیدائش سے لے کر ہجرت تک کے واقعات ہیں، دوسری جلد میں آپؐ کی مدنی زندگی کے بارے میں تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ جب کہ تیسری جلد میں رسول مقبولؐ کے وصال تک کا احوال قلم بند کیا گیا ہے۔ کلاسیکی شعرا کے علاوہ مولوی محمد مسلم نے 1864ء میں چھوٹی بحر میں "گلزار محمدی" لکھی جس میں وہ غزوہ خیبر کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہو سوار مدینیوں حضرتؐ ہوئے رواں
چودہ سو ہور نبیؐ دے نال ہو یا جوان
اٹھویں دن جا اپڑے خیبر وچ حضورؐ
اُترے گردے قلعے دے غازی ہو سرور

ترجمہ:

مدینہ سے سوار ہو کر حضرت محمدؐ روانہ ہوئے۔ چودہ سو جوان ان کے ہمراہ تھے۔ آٹھویں دن حضورؐ خیبر کے میدان جا پہنچے اور غازیوں نے خوشی خوشی قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

مولوی صاحب کا انداز بیان رواں اور سلیس ہے وہ اپنی بات عوام تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔

1871ء میں مولوی غلام رسول کی کتاب "قلمہ والے" میں آپؐ کا حلیہ مبارک شعروں میں بیان کیا گیا ہے۔ 1892ء میں وزیر آباد سے تعلق رکھنے والے مولوی عمر دین کی سیرت کی کتاب "ظہور اسلام" یعنی تواریخ اسلام شائع ہوئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں مولوی محمد مخدوم لنگر مخدوم، کی کتاب شائع ہوئی جس پر سن اشاعت درج نہیں۔ یہ کتاب پنجابی زبان کے معروف استاد، محقق اور نقاد ڈاکٹر شہباز ملک کے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔ معجزات رسولؐ مولوی قادر یار کی کتاب ہے جو نثر اور نظم دونوں میں لکھی گئی ہے۔ "انوار محمدی اور پنج گنج" کے نام سے سیرت کی کتب مولوی احمد دین نے تحریر کیں:

بادشاہ دین دا پیدا ہویا پیدا ہو گئی نور دی لاٹ اسمان تائیں
احمد دین جد نبیؐ دا دین آیا اللہ بھاگ لائی ہندوستان تائیں

ترجمہ:

دین کا بادشاہ پیدا ہوا تو آسمان تک روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ احمد دین جب نبیؐ کا دین ہندوستان پہنچا تو ہندوستان کی قسمت کو چار چاند لگ گئے۔

"خصائل محمدی" کے نام سے مولوی عبدالعزیز بن مولوی روشن دین کی کتاب 1908ء میں شائع ہوئی۔

1921ء میں سیرتؐ کی پہلی باقاعدہ کتاب شان حضورؐ شائع ہوئی جس میں حکیم عبداللطیف عارف نے اپنے فنی کمالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں حکیم صاحب نے مستند حوالہ جات کا استعمال کیا ہے اور تاریخی حقائق کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر جب نبی پاکؐ نے اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دی تو اس واقعہ کو حکیم صاحب "سرکار دی للکار" کا نام دیتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:

سنو! اک معبود برحق مولا تساں دین خلیل وسایا اے
چھڈو پیاریو! مندے کماں نوں، یارو ایہ کیچ کیہ تساں کھلاریا اے
بتاں گنگیاں ڈوریاں پوجے او ہتھیں جنہاں نوں تسیں اساریا اے
کفر شرک خُدا دے نال مندا ایہ سمجھان نوں میں اج ونگاریا اے

ترجمہ: سنو اے لوگو! ایک معبود برحق ہے جس نے یہ دین پیدا کیا ہے۔ اے پیارے لوگو بُرے کاموں کو چھوڑ دو، یہ اُلٹے کام تم کیوں کرتے ہو۔ جن بتوں کو تم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، تم اُن گونگے بتوں کو پوجتے ہو۔ خُدا کے ساتھ شرک کرنا غلط کام ہے، یہ سمجھانے کے لیے میں نے آج تم لوگوں کو بلایا ہے۔

1932ء میں میجر چوہدری فضل حق کی سیرت کی کتاب "سیرت الحبیب" کے نام سے شائع ہوئی جس میں انہوں نے عقلی دلائل سے کام لیا ہے۔ حاجی بخش کربلائی کی کتاب "سیرت رسولؐ 1941ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ مولوی اقبال دائم کی کتاب ہے جو 1942ء میں تحریر کی گئی۔ اس میں شاعر نے حضور اکرمؐ کی حیات کے اہم واقعات کو نہایت قرینے سے بیان کیا ہے۔

انہوں نے حضرت محمدؐ کی عظمت و بزرگی کو معیاری شعری ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ولایت امر تسری کی کتاب "کمبل پوش (توحید داباغ) ملک بشیر احمد اینڈ سنز، لاہور نے شائع کی۔ حاجی چراغ دین جونیکے والا کی "گلزار محمدی" 1953ء میں شائع ہوئی۔ اس میں شاعر نے ہر واقعہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ منظوم کیا ہے:

ماہ ربیع الاول ولوں ہے سی بارہویں یار
وچ مدینے پہنچیا عالم دا سردارؐ
کل مدینہ نکلیا کارن استقبال
ایساشان محبوب نوں بخشیا جل جلال

ترجمہ:

ربیع الاول کے مہینے کی بارہ تاریخ تھی جب دو عالم کا سردارؐ مدینے پہنچا، سارا مدینہ استقبال کے لیے باہر تشریف لے آیا، ایسی شان رب ذوالجلال نے اپنے محبوبؐ کو بخشی۔

"روح العباد دفی ذکر المعیاد" مولوی عبدالکرم قریشی قلعداری کی منظوم سیرتی کتاب ہے جس میں انہوں نے احادیث کے حوالے سے حضور اکرمؐ کی حیات کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔

"سید المرسلین" محمد یعقوب نقشبندی کی چار جلدوں پر مشتمل تفسیر کی کتاب ہے جس کی پہلی جلد 1960ء اور چوتھی جلد 1976 میں شائع ہوئی۔ حکیم صمصام کی منظوم سیرتی کتاب سہل اور پُر تاثیر انداز میں لکھی گئی ہے۔

گیا بچنا، آئی سوہنی جوانی، میں صدقے میرا پیر انج کر کے دھریا
کیوں آیا محمدؐ کیہ ویہندا سی ایتھے، کیوں ایتھے کھڑا سی، کسے نہ کہیا

ترجمہ:

آپؐ کا بچپن رخصت ہوا خوبصورت انداز میں جوانی نے اپنے پاؤں داخل کیے۔ محمدؐ کیوں آئے، کیا دیکھتے تھے، کہاں کھڑے تھے، کسی نے یہ سوالات نہ پوچھے۔

1982ء میں عالیہ فروغ احمد کی سیرت کی کتاب "آمنہ دالال" چھپ کر سامنے آئی "کونین داوالی" از ڈاکٹر مہر عبدالحق اور "سوہنے داخلق" از خدائے ظہوری بھی اسی برس شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید کی لکھی ہوئی غیر منقوط (جس پر کوئی نقطہ نہ ہو) سیرتی کتاب "الہادی" 1983ء میں چھپی۔

صوفی احمد علی ایم اے کی کتاب سچیاں سرکاراں کے نام سے 1993ء میں شائع ہوئی۔ مولوی غلام یار نے "نظارہ عشق" میں واقع معراج کو موضوع بنایا ہے۔ "سبز گنبد دے نظارے" حافظ محمد حسین حافظ کی کتاب ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن نے "گلزار صدیقی" میں ولادت نبویؐ کو بڑے من موہنے انداز میں بیان کیا ہے۔

قصور کے رہنے والے شریف انجم کی منظوم سیرت کی کتاب "حرا دا چانن" کے نام سے 2000 میں شائع ہوئی جو ان کے عشقِ رسولؐ اور شاعرانہ ذوق شوق کا حسین نمونہ ہے:

آکھیا رسول ﷺ جتھے لے جاوے او نٹھنی
رب دی رضا نال بہ جاوے او نٹھنی
اوس تھاویں چل کے تے ہوے گا قیام جی
اللہ پاک چاہیا جتھے کراں گے مقام جی
ایوبؓ دے مکان لاگیں رک گئیا و نٹھنی
رب دی رضا نال جھک گئی او نٹھنی

ترجمہ:

آپؐ نے کہا جہاں اونٹنی لے جائے گی رب کی رضا کے ساتھ جہاں اونٹنی بیٹھ جائے گی، اُسی جگہ قیام کروں گا جہاں اللہ پاک چاہے گا، حضرت ایوبؓ کے مکان کے قریب اونٹنی رُک گئی اور اللہ کی رضا میں اونٹنی جھک گئی۔

پنجابی شاعری کے ساتھ ساتھ پنجابی نثر میں بھی سیرت نگاری کی روایت کا آغاز حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے مواعظ سے شروع ہوتا ہے، تاہم پنجابی نثر میں باقاعدہ سیرت نگاریؐ کا آغاز دیر سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک برصغیر میں سرکاری زبان فارسی رہی جس وجہ سے پنجابی زبان میں سیرت نگاری کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد جب انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مختلف کہانیاں شائع کرنا شروع کیں تو مسلمانوں نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے جتن شروع کیے۔ انہوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات عام کرنے کے لیے مادری زبان کا سہارا لیا۔ یہی وہ دور تھا جب پنجابی نثر میں سیرتی ادب کی طرف دھیان دینا شروع کیا گیا۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے مواعظ کے بعد رانجھا برخوردار کی "بوہل نماز" اور "پکی روٹی" کو بھی

سیرتی ادب کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ کتب اُس مقاصد کو پروان چڑھاتی ہیں جن کو حضرت محمد ﷺ نے بیان کیا۔

مولوی جمال الدین نے خطبات نبویؐ کے نام سے حضرت محمد ﷺ کے خطبات کا پنجابی میں ترجمہ کیا۔ یہ 1909ء میں شائع ہوا، اس کے کل 32 صفحات ہیں۔ اس سے یہ بات کھل کے سامنے آتی ہے کہ اسی دور میں باقاعدہ سیرت نگاری کا آغاز پنجابی نثر میں ہوا۔ ''شان حضورؐ'' از حکیم عبداللطیف عارف کی تحریر کردہ سیرتی کتاب ہے جو 1921ء میں شائع ہوئی اور دوبارہ خیر البشرؐ کے نام سے 1924/25 میں چھپی۔ اس کتاب کے 135 باب نثر میں ہیں جبکہ 225 باب شعری صورت میں موجود ہیں۔ پنجابی ادب میں یہ ایک بہترین اضافہ تصور کیا جاتا ہے اس میں حکیم صاحب نے بڑی رواں نثر میں حیات طیبہؐ اور سیرت رسولؐ کے مختلف پہلوؤں اور واقعات کو زمانی ترتیب کے ساتھ بڑی سادگی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد سیوا سنگھ کی کتاب ''حضرت محمدؐ صاحب'' 1928ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک غیر مسلم کی طرف سے حضرت محمدؐ سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ کچھ محققین اس کتاب کو پنجابی نثری سیرت کی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں مصنف نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اُس کے اپنے مذہب کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ مثلاً ''ایہناں دی (حضور پاکؐ) دی ماتا اپنے پتی دی قبر تے نذرانہ چڑھان لئی مدینے گئی''۔ اس کتاب میں کئی مقامات پر مصنف کی کم علمی اور تعصب بھی جھلکتا ہے۔ محمد حبیب اللہ فاروقی کی ''نبیاں دا سردار'' 1942ء میں شائع ہوئی۔ اردو یا شاہ مکھی رسم الخط میں یہ سیرت کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے اس کے 252 صفحات ہیں اور یہ پنجابی آنرز کے طلبہ یعنی درسی مقاصد کے لیے تحریر کی گئی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد سیرت نگاری کی طرف پہلا قدم ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے اٹھایا انہوں نے 1949ء میں ''پنج ہادی'' لکھی جس میں حضور پاکؐ کے علاوہ چاروں خلفاء راشدین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو بڑے عالمانہ انداز میں تحریر کیا ہے اور قاری تک اپنا مدعا پہنچانے کے لیے بڑی رواں زبان استعمال کی ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے چاروں صحابہ اکرامؓ کی حیات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے آپؐ کی زندگی کو شروع سے لے کر آخر تک بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے ذیلی عنوانات یہ ہیں۔

1۔ ساڈے نبیؐ
2۔ یار غار
3۔ عمر فاروقؓ
4۔ عثمانِ غنیؓ

5۔ حضرت علیؓ

عبدالکریم ثمر کی سیرت پاکؐ کی کتاب "سچی سرکار ﷺ" 1962ء میں شائع ہوئی انہوں نے یہ کتاب محض سیرت پاکؐ بیان کرنے کے لیے تحریر نہیں کی بلکہ وہ ایک ایسی کتاب شائع کرنا چاہتے تھے جس سے اسلام کی تبلیغ کا مقصد بھی حاصل ہو اور جہاد کا درس بھی مل سکے۔ "سچی سرکار" 200 صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب ہے لیکن اس میں جامعیت موجود ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں جو باتیں بیان کی ہیں اُن کا حوالہ قرآن پاک کی آیات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اور جو واقعات حیات طیبہ سے بیان کیے ہیں ان کی دلیل بھی پیش کی ہے۔ اس کتاب کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

1980ء میں سمیع اللہ قریشی کی نثری سیرت کی کتاب "حضورؐ دی حیاتی" طبع زیور سے آراستہ ہوئی، اس کتاب کو پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے شائع کیا۔ اس کے کل چالیس صفحات ہیں، اگرچہ یہ ضخامت کے لحاظ سے کم ہے اور بچوں کے لیے تحریر کی گئی ہے لیکن اس کا انداز بیان بہت عمدہ ہے اور دلچسپی کا عنصر شروع سے لے کر آخر تک برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں کئی جگہ مکالمہ بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً جب حضورؐ غارِ حرا سے واپس آتے ہیں اور حضرت جبرائیلؑ کی آمد کا ذکر حضرت خدیجہؓ سے کرتے ہیں، تو اس گفتگو کو مکالموں کے انداز میں بیان کیا گیا ہے جو سیرت نبویؐ کی روایت میں ایک نیا اضافہ تھا۔ اس کتاب میں درجہ ذیل ذیلی عنوان شامل ہیں۔ حضورؐ دا بچپن، عرباں دی رہت بوہت (اندازِ زندگی)، جوانی دے رجھویں تے ویاہ، نبوت، اسلام دی تبلیغ تے کافراں دے ظلم، حبشہ ول ہجرت، ناکہ بندی، طائف ول سفر تے معراج شریف، ہجرت، کفر تے اسلام دے معرکے، حدیبیہ دا راضی نامہ، مکے دی فتح، بادشاہاں نوں اسلام دا سدا، آخری حج دا خطبہ، حضورؐ دا مہاندرا تے وصال۔

1980ء میں ہی ڈاکٹر سید اختر جعفری کی سیرت کی کتاب "حضورؐ پُر نور" شائع ہوئی۔ 79 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو پاکستان نیشنل بک کونسل کراچی کی طرف سے خصوصی انعام سے نوازا گیا۔ اس کتاب کو ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا۔ جس میں حضورؐ کی حیاتی کے مختلف واقعات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ 1981ء میں حمید اللہ ہاشمی کی "امت داوالی حضرت محمد ﷺ" پنجابی مجلس فیصل آباد کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس کے 144 صفحات اور 15 ابواب ہیں، اس کتاب میں تحقیق کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں سیرت نبویؐ کے متعلق نئی باتیں بتائی گی ہیں اور الفاظ کے معنی بتاتے ہوئے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

"چن عربوں چڑھیا" سلیم خان گمی نے تحریر کی جو 1982ء میں شائع ہوئی اس میں انہوں نے تحقیق و تنقید کو مدِ نظر رکھ کر سیرت کو تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کے کل 207 صفحات ہیں، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن کوئٹہ

سے خلات پبلیشرز نے شائع کیا جبکہ دوسرا ایڈیشن 1992ء میں سنگ میل پبلیکشنز لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب کی ابتدا میں 45 صفحات کا ایک مضمون "پنجابی وچ سیرت نگاری" کے نام سے شامل ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے پنجابی زبان میں شاعری اور نثر میں سیرت نگاری کی روایت بیان کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو لکھنے سے پہلے پنجابی میں سیرت نگاری کا بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے پنجابی ادب میں دینی ادب کی کمیوں کی نشاندہی کی ہے۔ سلیم خان گمی نے سیرت پاکؐ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ مکی زندگی کے بارے میں ہے اور دوسرا مدنی۔ 1982 میں ہی فدائے اطہر نے "سونے دا خلقؐ" کے نام سے علامہ شبلی نعمانی کی لکھی سیرت کا پنجابی میں ترجمہ کیا۔ "یاسعیدی یارسول اللہ" تنویر بخاری کی نعتوں کا مجموعہ ہے لیکن انہوں نے اس کے آخر میں سیرت رسولؐ کے بارے میں ایک جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ "رب دا حبیبؐ" حاجی چراغ دین جونیکے کی لکھی منظوم اور منثور سیرت کی کتاب ہے۔ 248 صفحات کی اس کتاب کو نئے لوگ پبلیکشنز لاہور نے شائع کیا۔ اس میں انہوں نے مقفیٰ اور مسجع نثر کا استعمال کیا ہے۔

اس کے علاوہ پنجابی زبان میں سیرت کی بہت ساری کتابوں کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ جن میں "النبی الخاتمؐ" از مناظر احسن گیلانی کا ترجمہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے کیا۔ اس کو سنگ میل پبلیکشنز لاہور نے شائع کیا۔ مولانا احمد سعید دہلوی کی کتاب "معجزاتِ رسولؐ" کا پنجابی ترجمہ دلشاد کلانچوی نے 1983ء میں کیا۔ "آمنہ دا لعلؐ" آمنہ فروغ احمد کی کتاب ہے جس میں انہوں نے آپؐ سے گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ 64 صفحوں کی یہ کتاب جولائی 1984ء میں چشتی کتب خانہ جھنگ بازار، فیصل آباد سے شائع ہوئی۔ بچوں کے لیے لکھی جانے والی اس کتاب میں منطق کی بجائے سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ محمد اقبال نجمی کی "سیرت حضورؐ دی" 1985ء میں فروغ ادب اکادمی گوجرانوالہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے 135 صفحات ہیں اور ذیلی عنوانات رسول پاکؐ کی حیات مبارکہ کے مطابق ہیں۔ محمد اقبال نجمی نے اس کتاب میں اسلام کی آمد سے پہلے عرب کے حالات کی تفصیل بیان کی ہے اور آپؐ کی آمد کے بعد وہاں کے حالات کیسے تبدیل ہوئے، اُن کو بڑے اختصار کے ساتھ آسان اور رواں زبان میں بیان کیا ہے۔ 1985ء میں قدر آفاقی کی سیرت رسولؐ کی کتاب "مکی مدنی ماہی" اردو پنجابی مرکز سمن آباد لاہور سے شائع ہوئی۔ پنجابی نثری سیرت میں اس کو ایک مستند کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی تعریف معروف اردو پنجابی نعت گو حفیظ تائب نے بھی کی ہے۔ قدر آفاقی نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ نعتیہ کلام، دوسرا حصہ سیرت رسول کے آغاز سے شروع ہوتا ہے جس میں آپؐ کے دیس یعنی عرب کی تفصیل سے لے کر عام الفیل تک کے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں عورت کے مقام اور قیامت سے پہلے کی نشانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب

کو پڑھتے ہوئے بہت ساری معلومات سامنے آتی ہیں جس سے مصنف کی محنت اور علم کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ 900 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے اگرچہ اس میں بھی کچھ سقم موجود ہیں۔ مولوی محمد سعید کی سیرت کی کتاب ''محمد ﷺ'' 1990ء میں عتیق پبلیشنگ ہاؤس لاہور نے شائع کی، 254 صفحات کی اس کتاب میں ڈرامائی انداز اختیار کیا گیا ہے اور ایک فرضی کردار مولوی عبدالحئ کی زبان سے سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی عالمانہ کوشش ہے، مکالمہ کے انداز میں سلسلہ چلتا ہے، ہر نشست میں گفتگو کے آغاز سے پہلے سلام دُعا ہوتی ہے اور گفتگو کے انداز میں بات آگے بڑھتی جاتی ہے۔ مولوی محمد سعید نے کتاب کا آغاز سیالکوٹ کے ایک گاؤں سے شروع کیا ہے جس کا باشندہ مولوی عبدالحئ ہے جو مولویانہ انداز میں لوگوں کو سیرت پاکؐ سے روشناس کرواتا ہے۔ اس میں 38 نشستیں ہیں جن میں عام لوگوں کو حضور پاک ﷺ کی حیاتی مبارک کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ حکیم محمد سعید نے بچوں کے لیے ''سب توں وڈے انسان'' کے نام سے 1991 میں شائع کرائی۔ اس میں حضرت محمدؐ کی بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا جذبہ بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے اور آپؐ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات بڑے دلچسپ اندز میں بیان کیے گئے ہیں تاکہ بچے اخلاقی سبق سیکھ کر دنیا میں انقلاب برپا کر سکیں، یہی حکیم صاحب کی اس کتاب کا مقصد تھا۔ 30 صفحات پر مشتمل ''خزینہ رسالت'' جبین گل ریاض کی کتاب ہے جو 1994ء میں چھپی اس میں سیرت کو کہانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن کہانی سناتے ہوئے کہیں بھی بے ادبی نہیں جھلکتی۔ صوفی احمد علی کی ''سچیاں سرکاراں'' اور ''نبی پاکؐ دے خطبے'' از شریف کنجاہی 1993ء میں شائع ہوئی۔ شریف کنجاہی نے اس میں حضور پاکؐ کی عقل، دانش و بصیرت اور عرب لوگوں کی کامیابی کا فلسفہ حیات بیان کیا ہے۔ اسی سال اخلاق احمد سعید کی کتاب ''ساڈا نبی ﷺ'' اور ''اسماء نبی ﷺ'' بھی شائع ہوئی۔ ''جہاناں دی رحمت'' الحاج محمد بہاؤالحق کی کتاب ہے جو اے ایس دے .پبلیشرز سیٹھ آدم جی عبداللہ نو لکھا بازار، لاہور کی طرف سے شائع ہوئی، 192 صفحات کی اس کتاب کو 57 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور آپؐ کی سیرت کو بیان کرتے ہوئے تاریخی حقائق اور منظر نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز رسول پاکؐ کے نصب سے ہوتا ہے جن کو منطقی اور مدلل انداز سے بیان نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر اختر جعفری کی ''نبی پاکؐ دے معجزے'' اور ''سرکار دی سیرتؐ'' از اظہر محمود 1995 میں شائع ہوئی جبکہ اظہر محمود کی ''حضور ﷺ دا ویریاں نال سلوک'' 1996 میں شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے حضور پاکؐ کے حُسن سلوک کو موضوع بنایا ہے اور آپ کے رحمت اللعالمین کے وصف کو بیان کیا ہے۔

سعیدہ رشم نے 1997ء میں پنجابی میں سیرت نگاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اپنے مقالے کے علاوہ انہوں نے ''سیرت پاک محمدؐ دی'' کے نام سے ایک کتاب 1985ء میں لکھی جس کے 126 صفحات ہیں، یہ ویمن رائٹنگ فورم فیصل آباد نے شائع کی۔ سعیدہ صاحبہ نے زیادہ تر حوالے قرآن اور احادیث سے لیے ہیں اور سیرت کے تمام اہم واقعات کو رسول پاکؐ کی نصب پدری و مادری سے لے کر جنازہ تک کو بیان کیا ہے اور آخر میں آپ کی حیاتِ مبارکہ کے اوصاف کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے پوری کتاب میں عقیدت و احترام کا دامن پکڑے رکھا ہے۔ میاں ظفر مقبول کی کتاب ''النبی کریمؐ'' 1999ء میں سائیں مولا شاہ ویلفیر سوسائٹی گوجرانوالہ نے شائع کی، اس کتاب کا انتساب انہوں نے رسول پاکؐ کے فرزندان حضرت قاسمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عبداللہؓ کے نام کیا ہے۔ اس کتاب کو حکومت پنجاب کی طرف سے سیرت ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس کتاب میں انہوں نے تحقیقی انداز اختیار کرتے ہوئے متعدد جگہ پر دوسری کتابوں کے حوالہ جات بھی درج کیے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دیگر زبانوں کی سیرت کی کتابوں کا خاصہ مطالعہ کیا تھا۔ ''نور نبی دیاں کرناں'' اظہر محمود کی کتاب ہے جو 2000 میں شائع ہوئی۔ یہ صوبائی اور صدارتی انعام یافتہ کتاب ہے، اس کتاب کو عقلی انداز سے تحریر کیا گیا ہے، آپؐ کے جمال و کمال کی باتوں کرتے ہوئے حضور پاکؐ کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ سجاد بخاری کی ''مومناں دیاں ماواں'' دسمبر 2001 میں شائع ہوئی، انہوں نے قرآن پاک سے بہت سے حوالے لیے ہیں اور سیرت کے دیگر مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں حضور اکرمؐ کا شجرہ مبارک، آپ کی اذدواجی زندگی اور آپ کا حُسن سلوک خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ''سیرت داچانن'' اخلاق عاطف کے سیرت رسولؐ کے چھ مقالات کا مجموعہ ہے جو 2003 میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اصغر علی جاوید کی 16 ابواب اور 407 صفحات پر مشتمل کتاب ''حیاتی حضورؐ دی'' 2012 میں کتاب سرائے دے بیت الحکمت لاہور نے شائع کی جو کہ ایک جامع سیرتی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

پنجابی زبان کے دیگر لہجوں سرائیکی، ہندکو، پوٹھوہاری اور پہاڑی وغیرہ میں بھی سیرتِ رسولؐ منظوم اور منثور صورت میں ملتی ہیں۔ پنجابی نثر میں سیرت کا آغاز پندرہویں صدی میں ہوتا ہے جبکہ اس سے پہلے شاعری میں اس پر خاصہ کام ہو چکا تھا۔ اس بھرپور روایت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پنجابی زبان میں سیرت نگاری کی طرف ابتدا سے ہی توجہ دی گئی اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے اس کی رفتار قدرے سست تھی لیکن بعد میں نظم اور نثر میں سیرتی ادب کی طرف رجحان پروان چڑھا۔ یہ سفر تیزی سے رواں دواں ہے اور

آنے والے وقت میں بھی جاری رہے گا کیونکہ پنجاب سرکار نے ہر سال سیرت ایوارڈ کے ذریعے مادری زبانوں میں سیرت نگاریؐ کی حوصلہ افزائی کی ہے جو کسی بھی ادب کی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

خود آزمائی

1۔ پنجابی ادب میں ابتدا ہی سے مذہبی موضوعات غالب رہے ہیں۔ بحث کیجیے۔

2۔ پنجابی ادب میں حمد کی روایت بیان کیجیے۔

3۔ پنجابی میں ہونے والے قرآن حکیم کے تراجم اور تفاسیر کا تعارف کرائیے۔

4۔ پنجابی ادب میں نعت کی روایت تحریر کرتے ہوئے چند اہم نعتیہ مجموعات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ پنجابی نظم و نثر میں سیرت نگاری کی بھرپور روایت موجود ہے۔ مفصل مضمون تحریر کیجیے۔

یونٹ نمبر6

پنجابی کے صوفی شاعر

تحریر: ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی: ڈاکٹر عبد الواجد تبسم

فہرست

یونٹ کا تعارف		118
یونٹ کے مقاصد		118
6.1	تصوف اور اس کی مختصر روایت	119
6.2	بابا فریدؒ	120
6.3	شاہ حسینؒ	122
6.4	سلطان باہوؒ	124
6.5	بلھے شاہؒ	127
6.6	وارث شاہؒ	129
6.7	میاں محمد بخشؒ	132
	خود آزمائی	135

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ پنجابی صوفی شعرا کے متعلق ہے۔ پنجابی صوفی شاعری میں بابا فرید، شاہ حسین، سلطان باہو، بلھے شاہ، وارث شاہ اور میاں محمد بخش جیسے عظیم شعرا شامل ہیں، جنہوں نے اپنی شاعری میں تصوف، عشق حقیقی اور انسانیت کے اصولوں کو بیان کیا۔ پنجابی صوفی شعرا نے لوگوں کے دلوں کو اللہ کی محبت، امن، اور انسان دوستی کے پیغام سے روشناس کرایا۔ صوفی شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے محبت، حقیقت، اور معرفت کے پیغامات کو عام کیا۔

پنجابی صوفی شعرا کی یہ روایت لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے اور ان کے پیغام کو سمجھنا اور اپنانا ہماری روحانی اور اخلاقی زندگی کو نکھارتا ہے۔ اس یونٹ میں ہم اہم پنجابی صوفی شعرا کے احوال و آثار کے بارے میں پڑھیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ تصوف اور اُس کی مختصر روایت بیان کر سکیں۔

2۔ بابا فرید گنج شکرؒ کی تعلیمات کے بارے میں جان سکیں۔

3۔ شاہ حسینؒ کے احوال و آثار سے روشناس ہو سکیں۔

4۔ سلطان باہوؒ کی حیات اور تعلیمات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

5۔ بلھے شاہؒ کے فن و فکر سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

6۔ پنجابی زبان کے عظیم شاعر وارث شاہؒ کے احوال و آثار اور اُس کی لازوال تخلیق ہیر کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔

7۔ میاں محمد بخشؒ کے کلام کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہو سکیں۔

پنجابی کے صوفی شاعر

6.1 تصوف اور اس کی مختصر روایت:

تصوف عربی زبان کے لفظ صوف سے نکلا ہے جس کے معنی اون کے ہیں اور صوفی وہ لوگ ہیں جو دنیاداری اور ظاہری رکھ رکھاو کو چھوڑ کے اون کا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ اگر لفظ صوف کا مطلب یونانی زبان میں دیکھا جائے تو اس کا معنی عقل مند اور دانش مند ہے لیکن چوں کہ تصوف کو اسلام کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے تو اول الذکر بات درست معلوم ہوتی ہے۔ کچھ اہلِ قلم صوفی ان سادہ منش لوگوں کو گردانتے ہیں جو اون کا لباس پہنتے ہیں جب کہ کچھ اہل دانش کا خیال ہے کہ اسم ''صوف'' لفظ صفا سے مشتق ہے اور صوفی اہل صفا سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت ممشاد علی دینوری کا نقطہ نظر ہے کہ فضول چیزوں اور نفس پرستی کو ترک کر کے اسوہ حسنہ کے مطابق زندگی گزارنے کا نام تصوف ہے۔ حضرت سبل بن عبداللہ کہتے ہیں کہ کم کھانا، خلقت سے دور رہنا اور خالق کی پوجا کرنا تصوف ہے۔ حضرت جنید بغدادی صوفی کی تعریف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو خلت (دوستی) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے، تسلیم حضرت اسماعیل علیہ السلام سے، غم و اندوہ حضرت داود علیہ السلام سے، شوق حضرت موسٰی علیہ السلام سے اور اخلاص حضرت محمدؐ سے حاصل کرے۔

تصوف کے بارے میں حضرت محمدؐ کی حدیث مبارکہ ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اگر تم نہیں دیکھتے تو اللہ تعالیٰ تحقیقی طور پر تمہیں دیکھتا ہے''

ان تعریفوں کو مدِ نظر رکھ کے کہا جا سکتا ہے کہ تصوف اللہ تعالیٰ کی یاد میں مگن رہنے، نفس پر قابو پانے کا نام ہے۔ جب وہ ذات حقیقی انسان کو ہر چیز سے عزیز ہو جائے اس کے دل میں رب کو راضی کرنے کے سوا کوئی خواہش باقی نہ رہے اور وہ زندگی کی سب آسائشوں کو رب کی رضا پر قربان کر دے تو پھر وہ تصوف کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

اسلامی تصوف کی بنیاد بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو للیث لکھتے ہیں: ''اسلامی تصوف کی بنیادیں قرآن کی تعلیمات احادیث نبویؐ، صحابہ کرام کی پاک زندگی، تابعین اور تبع تابعین کی پاک سیرت پر استوار ہوتی ہیں اور سچے مسلمان صوفی نہ کبھی حدود شرعیہ سے باہر نکلتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے ترک دنیا، راہبانیت، بے عملی اور کاہلی کی تلقین کی ہے۔''

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور حیات کے ہر پہلو کے بارے میں قرآن کا موضوع انسان ہے اس میں عمودی یا متوازی جہات کے ساتھ انسانی زندگی کے تمام معاملات آ جاتے ہیں۔ تصوف دنیا کو تیاگ کرنے کا نام نہیں بلکہ اللہ اور اس کے نبیؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا نام ہے۔ برصغیر میں اسلام عربوں کی آمد کے ساتھ ساتویں صدی عیسوی میں پھیلنا شروع ہوا لیکن جلد ہی یہاں ایرانی حکمرانوں نے حکومتیں قائم کرنا شروع کر دیں یوں پنجاب اسماعیلی فکر کا پہلا گڑھ بنا جس کا مرکز ملتان، اوچ اور ٹھٹھہ تھا اور یہیں سے تصوف کے کئی روشن مکتبہ فکر پیدا ہوئے۔ تصوف دراصل ایرانی فکر کا تہذیبی، ثقافتی اور تخلیقی رویہ جو عرب شہنشاہت کے خلاف پیدا ہوا کیونکہ حضور اکرمؐ سے پہلے اور ان کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی کچھ عرب اشرافیہ نے جو حکومتی رویے اپنائے اس سے عرب قبائلی سماج کی روح مجروح ہوئی۔ اسلام جو سادگی اور مساوات کا درس دیتا ہے جس میں رنگ و نسل، ذات پات کی بنیاد پر کسی کو برتری حاصل نہیں تھی لیکن جب عرب اشرافیہ میں اسلامی تعلیمات کے برخلاف رنگ و نسل کا تفاخر بڑھا اور انہوں نے دوسری اقوام کو غلام بنانا چاہا تو ایرانی خود کو تہذیبی طور پر عرب سے کم تر ماننے کو تیار نہ ہوئے اور حضرت محمدؐ کا اسلام نافذ کرنے کے لیے تحریک شروع کی۔ عرب کے ابتدائی حکمرانوں میں انہیں حضرت علیؓ سے خاص انس اور عقیدت تھی کیوں کہ وہ حضرت محمدؐ کے بتائے ہوئے راستے پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسولؐ سے پوری طرح رہنمائی حاصل کر کے اسی کی سادگی، مساوات اور تقویٰ کو بنیاد بنائے رکھا۔ آگے چل کر یہی فکر اسلامی تصوف کا بنیادی اصول بنی۔ جس کو پنجابی صوفی شعرا نے اپنا نصب العین بنالیا۔ یہ صوفی شعرا حکومتی نظم و نسق سے دور رہے اور لوگوں میں اچھے اخلاق کی تبلیغ کرتے رہے۔ پنجابی میں صوفیانہ شاعری کی بھرپور روایت موجود ہے جس کا آغاز بابا فرید گنج شکرؒ سے ہوتا ہے اور جدید پنجابی شاعری بھی صوفیانہ فکر سے مبرا نہیں۔ اس یونٹ میں ہم اہم پنجابی صوفی شاعروں کے حیات و فن و فکر کا مختصر جائزہ لیں گے جنہوں نے اعلیٰ انسانی اقدار اور دین کی تبلیغ کو زندگی کا مقصد بنالیا اور اپنے کلام کے ذریعے اس کا پرچار کرتے رہے۔

6.2 حضرت بابا فرید گنج شکرؒ:

پنجابی شاعری کا بادآدم بابا فریدؒ کو کہا جاتا ہے ان صاحب کرامت عظیم صوفی شاعر کا نام کہیں فرید الدین مسعود اور کہیں مسعود الدین فرید لکھا نظر آتا ہے۔ کئی کرامات کی وجہ سے ان کو گنج شکر کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آپ ۵۷۴ھ بمطابق ۱۱۸۱ء میں ملتان سے 10 کلومیٹر دور کوٹھیوال میں پیدا ہوئے اور

679ھ / 1280ء میں پاکپتن میں وفات پاگئے۔ آپ کا شجرہِ نسب حضرت فاروق اعظم سے ملتا ہے۔ آپ کے والد کا نام جمال الدین تھا۔

آپ نے کوٹھیوال میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر مولانا منہاج الدین ترمذی سے کسب فیض حاصل کیا۔ آپ نے خواجہ معین الدینؒ کے ذریعے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی بیعت کی اور روحانی علم و برکات حاصل کی۔ آپ حضرت بختیار کاکی کی وفات کے بعد ان کے جانشین مقرر ہو گئے پھر آپ یہاں سے پاکپتن جسے اُن دنوں اجودھن بھی کہا جاتا تھا، تشریف لے گے۔ آپ کی دو بیٹیاں اور چھ بیٹے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ ان کے داماد تھے اور حضرت علی احمد بابر کلیری ان کے بھانجے تھے۔ آپ کا کلام اشلوک کہلاتا ہے جس کا مطلب ہے "شاہ کا کلام" یہ دو مصرعوں کا ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے کے درمیان وسرام (وقفہ) ہوتا ہے۔

بابا فریدؒ نہ صرف پنجابی بلکہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے بھی شاعر تھے۔ آپ کی پنجابی شاعری مختلف کتابوں میں ملتی ہے۔ حضرت بابا فرید کی شاعری میں تصوف و اخلاق بڑے دلکش انداز ہیں بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کی اعلیٰ تعلیمات سے متاثر ہو کر سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک نے آپ کا کلام اپنی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب میں شامل کیا۔ آپ کی شاعری میں فنا، توحید، قیامت، حیات بعد از موت، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، اخلاقیات، انسان دوستی اور اللہ کی عبادت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آپ کی شاعری میں معاشرے کی تعمیر، کردار کی اصلاح اور تبلیغ اسلام کا مقصد نظر آتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اُٹھ فریدا وضو ساز، صبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نیویں، سو سر کپ اتار

ترجمہ:

آپ فرماتے ہیں کہ صبح صبح اٹھ کر وضو کی نماز پڑھنی چاہیے، جو سر اللہ کی بارگاہ میں نہیں جھکتا اسے کاٹ دینا چاہیے۔

ایک اور جگہ بابا فرید فرماتے ہیں:

فریدا جے توں عقلِ لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ
اپنے گریباں میں سر نیواں کر کے دیکھ

ترجمہ:

آپ فرماتے ہیں کہ فرید اگر تم عقل لطیف ہو تو اپنے اعمال نامے کو سیاہ مت کرو اور اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھ کہ تیرے اعمال تیرے عقلِ لطیف ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

یہ اشلوک خود احتسابی کی طرف راغب کرتا ہے۔ مزید بر اُں بابا فریدؒ کے اشلوک معاشی و سماجی اصلاح کی تعلیمات بھی دیتے ہیں۔

رُکھی سکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی
فریدا ویکھ پرائی چُپڑی ناترسائیں جی

ترجمہ:

جو روکھی سوکھی جو تجھے کھانے کو ملتی ہے اُسے کھا اور پانی پی کر مطمئن ہو جا اے فرید ا دوسروں کی چپڑی روٹی (گھی والی روٹی) دیکھ کر للچانا نہیں چاہیئے۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اپنے کلام اور تعلیمات کی بدولت نہ صرف پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں مقبول اور ہر دل عزیز ہے۔

6.3 شاہ حسینؒ:

آپ کا نام شاہ حسین اور والد کا نام شیخ عثمان تھا۔ آپ ٹیکسالی دروازے کے قریب تل بگھ نامی محلہ کے رہنے والے تھے۔ شاہ حسین تل بگھ محلہ میں 945ھ / 1538ء میں پیدا ہوئے اور آپ کے جد اعلیٰ رائے کلجس نے فیروز شاہ تعلق کے دور میں اسلام قبول کیا۔

شاہ حسین نے حافظ ابو بکر سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے دس سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ انہی دنوں حضرت شیخ بہلول دریائی مولوی حافظ ابو بکر سے ملنے آئے تو شاہ حسین ان کے مرید ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار پر باقاعدہ حاضری کی تلقین کی۔ آپ روزانہ وہاں حاضری دیتے اور رات کو دریائے راوی میں کھڑے ہو کر قرآن پاک کی تلاوت فرماتے۔ 36 سال کی عمر میں حضرت شیخ سعد اللہ لاہوری سے تفسیر مدارک پڑھ رہے تھے، جب آپ اس آیت مبارکہ پر پہنچے جس کا ترجمہ یہ ہے، دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے تو آپ پر وجد طاری ہو گیا، اس سے شاہ حسین کی زندگی تبدیل ہو گئی، وہ بے خودی کے عالم میں مدرسے سے باہر نکل آئے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ جب حضرت بہلول دریائی کو ان کی اس حالت کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے ان کو لاہور آکر اُنہیں قرآن پاک سنانے اور نماز ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ جب آپ اس آیت مبارکہ پر پہنچے (الم نشرح لک صدرک) ترجمہ: کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا تو زور دار

قہقہ لگایا اور نماز توڑ کر مسجد سے باہر نکل گئے پھر ان کی ساری زندگی بے خودی اور مجذوبیت کی حالت میں گزر گئی۔

شاہ حسین نے داڑھی مونچھ صاف کرلی، شراب کی بوتل پکڑ کر راگ رنگ کی محفلوں میں جانے لگ گئے، نشے کی حالت میں گلیوں بازاروں میں ناچنے گانے لگ گئے۔ دراصل شاہ حسین صوفیا کے ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ فرقہ آزاد زندگی گزارتا ہے، لوگوں کی طعن و تشنیع اور لعنت و ملامت سے تزکیہ نفس حاصل کرتا ہے۔ مغل شہزادے دارالشکوہ نے لکھا ہے کہ شہزادہ سلیم اور شہنشاہ اکبر کے حرم کی خواتین شاہ حسین کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ شہزادہ سلیم آپ کی روحانی طاقت کو بہت زیادہ مانتا تھا۔ شاہ حسین کو راوی کی دوسری طرف شاہدرہ میں رہنے والے ایک برہمن لڑکے مادھولال سے محبت ہوگئی اور پیر و مرید کی محبت اس قدر بڑھی کہ شاہ حسینؒ مادھولال حسین کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ جمادی الثانی 1008 ھ بمطابق 1599ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ آپ کو پہلے راوی کنارے دفن کیا گیا اور بعد میں دریائے راوی کا رخ بدلنے کی وجہ سے باغبانپورہ میں دفن کر دیا گیا جہاں ہر سال مارچ کے آخری ہفتہ اور اتوار کو میلہ چراغاں منایا جاتا ہے، یہ لاہور کا مشہور میلہ ہے۔

شاہ حسین کافی کے بانی ہیں، شاہ حسین کا کلام کافیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ آپ کے کلام کو مختلف راگ راگنیوں میں گایا گیا ہے۔ آپ کی شاعری کا انداز صوفیانہ ہے۔ انداز بیان بڑا موثر، دل نشین اور رسیلا ہے شاعری میں صوفیانہ اور معرفت کا رنگ نمایاں ہے۔ عمل کا درس آخرت کی تیاری اور انسانیت کا درس اُن کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ آپ غرور اور تکبر سے نفرت کرتے ہیں اور شر سے دور رہنے کا درس دیتے ہیں۔

نمونہ کلام

ربا میرے دل دا محرم توں
اندر توں باہر توں، روم روم وچ توں
توں ہی تانا، توہی بانا، سب کچھ میرا توں
کہے حسین فقیر نمانا، میں ناہیں سبتوں

ترجمہ:

اے اللہ تو میرے حال کو جانتا ہے، میرے اندر بھی تو ہے اور باہر بھی تو ہے میرے روئیں روئیں میں تو بستا ہے۔ تو ہی میرا لباس حیات ہے، میرا سب کچھ تو ہے حسین جو فقیر مسکین ہے یہ تسلیم کرتا ہے کہ میں کچھ نہیں سب کچھ تو یعنی رب کی ذات ہے۔

شاہ حسین عشق حقیقی میں دیدار کی خاطر تڑپتے ہیں اور ہجر کی ان گھڑیوں کا بیان اُن کی شاعری کی روح ہے۔ انتظار اور ہجر کے لمحوں کو وہ ہیر اور رانجھا کے استعارات کے ذریعے یوں بیان کرتے ہیں:

سجن دے بن راتاں ہویاں وڈیاں
ماس جھڑے، جھڑ ہجر ہوئیاں، کڑ کن لگیاں ہڈیاں
عشق چھپیاں چھپدا ناہیں، برہوں تناواں گڈیاں
رانجھا جوگی میں جگیانی، میں کیہ کر چھڈیاں
کہے حسین فقیر سائیں دا، دامن تیرے لگی آں

ترجمہ:

ساجن کے بغیر راتیں لمبی ہو گئی ہیں جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے اور ہڈیاں کڑکتی ہیں عشق چھپائے نہیں چھپتا، ہجر و فراق نے مجھے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ رانجھا جوگی ہے اور میں جوگن، اس نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ اللہ کا فقیر شاہ حسین کہتا ہے کہ اب میں نے تمہارا دامن پکڑ لیا ہے۔

6.4 حضرت سلطان باہوؒ:

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو برصغیر کے عظیم صوفیا میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں 1034ھ / 1449ء میں شور کوٹ کے گاوں اعوان میں ماہ رمضان میں پیدا ہوئے اور وہیں جمادی ثانی 1039ھ / 1629ء کو جمعرات کے دن وفات پائی۔ آپ کی والدہ کا نام راستی تھا جنہوں نے آپ کا نام باہو رکھا، عین الفقر میں آپ فرماتے ہیں:

رحمت و غفران بود بر استی
راستی از راستی آراستی

آپ لفظ باہو کے بارے میں خود بیان کرتے ہیں:

ذاتے نال جے ذات رلے تد باہو نام سدائیں ہو

ترجمہ:

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ذات کو محبوب حقیقی کی ذات میں غرق کر دیا تب اپنا نام باہو کہلوایا۔
آپ نے اپنی کتابوں میں اپنا نام باہو لکھا ہے، سلطان کا لفظ عارفانہ عظمت و فکر کی وجہ سے لقب کے طور پر ساتھ لگ گیا۔ حضرت سلطان باہو کے والد کا نام بازید محمد تھا، آپ درویش صفت انسان تھے، ان کو ان کی عسکری خدمات کی وجہ سے شاہجہان کی طرف سے شور کوٹ میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ آپ اعوان قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا شجرہ نسب حضرت علیؓ ملتا ہے۔ حضرت سلطان باہو پیدائشی ولی تھے۔ آپ کو روحانی علم حاصل تھا۔ آپ کو باطنی فیض حضرت محمد رسالت مابؐ سے حاصل ہوا۔ آپ نے ظاہری بیعت حضرت پیر عبدالرحمٰن دہلوی گیلانی کے ہاتھ پر کی اور روحانی بیعت سرورِ کائنات حضرت محمدؐ کے ہاتھ پر کی۔ اس کے بعد باطنی بیعت حضرت پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کے ہاتھ پر کشف کے ذریعے کی۔ حضرت سلطان باہو باطنی علم حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو رشد و ہدایت کا درس دینے لگے۔ آپ کو وفات کے بعد دریائے چناب کے قریب گاؤں قہر گان میں دفن کیا گیا مگر 1775ء میں دریائے چناب نے مزار کی طرف رخ پھیرا تو آپ کے مریدوں نے آپ کا جسد خاکی وہاں سے نکال کر موجودہ جگہ پر دفن کر دیا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے درس تصوف و اسلوب کے لیے فارسی زبان کو اپنایا اور ان کی فارسی زبان میں لکھی گئی کتب کی تعداد ایک سو چالیس کے قریب ہے مگر ان کی ابیات جو ان کی شہرت کا باعث بنی وہ پنجابی زبان میں ہیں۔ ان کے کلام میں راست گوئی، عشق حقیقی اور حق گوئی کے جذبات نظر آتے ہیں۔ اسلوب بیان سادہ ہے اور اس میں انہوں نے تکلف اور تصنع کام نہیں لیا۔ انہوں نے اللہ کی واحدانیت کو اپنے فکر کی بنیاد بنایا، طلب اللہ کو سچی طلب کی راہ بتائی۔ آپ نے ان ناپسندیدہ عناصر کی قلعی کھول کر رکھ دی جو ملت و معاشرے میں خرابیاں پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان میں مادہ پرست علما عوام الناس کو گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ آپ اپنے من میں جھانکنے کی تلقین کرتے ہیں آپ وحدت الوجود اور واحدت الشہود کو یگانگت دینے والے پہلے صوفی ہیں۔ آپ نے ضرورت مرشد کامل کا درس دیا اور راہِ سلوک اور معرفت ذات کے حصول کی تلقین کی۔

حضرت سلطان باہوؒ کی ابیات کا قدیم ترین مجموعہ جو کہ کتابی شکل میں ہے وہ ہے جملہ ابیات حضرت سلطان باہوؒ صاحب جس کے مولف حاجی محمد الدین ہیں جو 1109ھ با 1891ء میں مطبع عزیز عالم پریس، گجرات سے شائع ہوا یعنی آپ کی وفات کے دو سو برس کے بعد طبع ہوا۔ یہ ابیات ان دو سو برسوں میں قوالوں، درویشوں، ادھورے مخطوطات عوام اور اولیا کی یاداشتوں کے ذریعے چلتے رہے۔ انھیں اس قدرے توجہی کی گرد سے آلود کیا گیا کہ اب نہ ان کا درست رنگ و حلیہ نظر آتا ہے اور نہ ہی ان کے وزن کا پتہ چلتا ہے۔ موجودہ

دور میں سلطان الطاف علی نے تحقیق کے حوالے سے ابیات باہو مرتب کی ہے اس میں ابیات کی تعداد 202 ہے ڈاکٹر سید نذیر احمد نے کلام سلطان باہوؒ (پنجابی) کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اس میں ابیات کی تعداد 188 ہے۔

حضرت سلطان باہوؒ کے پنجابی ابیات کی خاص بات یہ کہ ان کا ہر لفظ 'ہو' پر جو اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے پر ختم ہوتا ہے۔ فقیر نور محمد کلانچوی لکھتے ہیں کہ اصل ابیات میں ہو کا لفظ نہیں تھا۔ اس کا بعد میں اضافہ ہوا یہ مسلہ اس لئے پیدا ہوا کہ کسی مصرعے سے ہو کی ردیف نکال دینے سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ابیات باہو کے پرانے مجموعوں میں ہو کی ردیف موجود ہیں۔ سلطان الطاف علی کہتے ہیں کہ ردیف ہو حضرت سلطان باہو کا خود لگایا ہو ردیف ہے۔ دیوان باہو کے ابتدائی اشعار میں ہو کا لفظ واضح طور پر استعمال ہوا ہے۔

نمونہ کلام

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملسیں ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلاں تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو جیں ایہ بوٹی لائی ہو

ترجمہ:

اسم اللہ جو کہ چنبے کی بوٹی پر مہک ہے، اسے میرے مرشد نے میرے من میں لگا دیا ہے اور نفی اثبات کا پانی اس کے ہر رگ وریشہ میں دے دیا گیا ہے جب یہ غنچہ کھلنے لگا تو اس نے میرا باطن اپنی خوشبو سے معطر کر دیا ہے، اے باہو اللہ اس مرشد کامل کو سلامت رکھے جس نے یہ پودا میرے من میں لگایا ہے۔

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیا جانے ہو
وچے بیڑے، وچے جھیڑے، وچے ونجھ مہانے ہو
چوداں طبق دلے دے انڈر تنبو وانگوں تانے ہو
جوئی دل دا محرم ہووے سوئی رب پچھانے ہو

ترجمہ:

اللہ کے بندوں کے دل دریا کی طرح کھلے ہیں، جو سمندر سے بھی گہرے ہیں۔ دریا کے اندر کشتیاں، ملاح، جھکڑ موجود ہوتے ہیں تو اسی طرح تمام کائنات عارفان کامل کے دلوں میں موجود ہے اور چودہ طبقات ان

کے دلوں میں سمائے ہوئے ہیں اور عشق نے اپنے خیمے گاڑے ہوئے ہیں اور باہو اللہ کو ویسے پہچان سکتا ہے جو دل کا محرم ہو یعنی من عرف نفسہ فقط عرف ربہ۔

6.5 بُلھے شاہؒ:

حضرت سید بابا بلھے شاہؒ کا اصل نام عبد اللہ شاہ تھا وہ عظیم صوفی اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ آپ کے والد کا نام سخی شاہ محمد درویش تھا، آپ کا سلسلہ نسب حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ سے جا کر ملتا ہے۔ بلھے شاہ کی ولادت 1091ھ/1680ء میں اُچ شریف میں ہوئی۔ آپ ابھی چھ برس کے تھے کہ آپ کے والد نقل مکانی کرتے ہوئے ساہیوال کے گاوں ملک وال میں آباد ہو گئے پھر وہاں سے تحصیل قصور کے گاوں پانڈ دکی کا چوہدری پانڈو بھٹی انہیں امامت اور درس و تدریس کے لیے اپنے گاؤں لے آیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے قصور کے مولوی غلام مرتضیٰ قصوریکے مدرسے سے ظاہری علم حاصل کیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر لاہور آ گئے اور حضرت شاہ عنایت قادریؒ کے مرید ہو گئے۔ انہوں نے گیلانی سید ہونے کے باوجود ایک ارائیں شاہ عنایت قادریؒ کی مریدی کی اور خوشی سے کہتے تھے کہ بلھے شاہ کو سید نہ کہو وہ بھی ارائیں ہے یعنی دنیائے فقر میں نام و نسب بے کار ہے۔ آپ نے ساری زندگی قصور میں گزاری اور وہیں 1171ھ/1757ء کو وفات پائی۔ آپ نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ بلھے شاہ کا دور پنجاب میں بدامنی کا دور تھا، اس پر آشوب دور میں ہر طرف ظلم و بربریت پھیلی ہوئی تھی۔ مغلوں کے درمیان حصولِ اقتدار کی جنگ جاری تھی۔ مغلوں کی اندرونی کشمکش، سکھوں کی یلغار، لوٹ مار، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام انسانوں کا کیا حال ہو گا۔ بلھے شاہ کا زمانہ معاشی، معاشرتی، سیاسی و مذہبی غرض ہر لحاظ سے افراتفری کا دور تھا اس سے پہلے پنجابی شعرا نے یہ حال کبھی نہ دیکھا تھا۔ پنجاب کو اپنے سامنے اُجڑتا دیکھ کر پنجابی شعرا خاموش نہ رہ سکے۔ اس صورتِ حال میں بلھے شاہ پکار اُٹھے:

درکھلا حشر عذاب دا برا حال ہویا پنجاب دا
ڈرہا دیے دوزخ ماریا سانوں آمل یار پیاریا

ترجمہ:

حشر عذاب کا دروازہ کُھلا ہے، پنجاب کا بُرا حال ہے یہ دوزخ کی مانند ہے کبھی تو آ کے ملو اے پیارے دوست۔

بلھے شاہ اپنے دور کے بے باک اور سچے صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے لوگوں کی زندگی پر سیاسی بد نظمی کا جو اثر ہوا اُسے یوں بیان کیا ہے:

جدوں اپنی اپنی پے گئی　　دھی ماں نوں لٹ کے لے گئی
منہ بارھویں صدی پسار یا　　سانوں آمل یار پیار یا

ترجمہ:

جب آپا دھاپی پڑ گئی تو بیٹی ماں کو لوٹ کے لے گئی بارھویں صدی آنے والی ہے اے پیارے دوست ہمیں آ کر ملو۔

بلھے شاہ کی شاعری میں بے باکی، راست گوئی اور حق گوئی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع عشق حقیقی اور توحید باری تعالیٰ ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ نام نہاد عالموں کی ہوس زدہ منافقت اور خواہش اقتدار کی نفی میں کہا گیا ہے۔ انہوں نے محبت الہیٰ، انسانوں کی بلا تفریق و امتیاز محبت اور عملِ صالح کو اصلی نیکی اور درست مذہب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اللہ سے دل لگائے بغیر تمام عبادتیں اور ریاضتیں بے کار ہیں۔ ان کی کافیوں میں زبان سادہ اور عام فہم ہے، ان کی شاعری آفاقی اور پوری انسانیت کی شاعری ہے۔ جس میں عالمگیریت اور تاثیر کی فراوانی ہے۔ بلھے شاہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ایک صوفی فنافی الشیخ اور فنافی الذات درویش تھے، وحدت الوجود کے نظریہ کے قائل تھے۔ اس ہمہ اوست کے نظریے پر ساری زندگی کاربند رہے ان کی شاعری میں تینوں درجات فنافی الشیخ، فنافی الرسول، فنافی اللہ نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے ایک حق شناس مرد اور عارف باللہ جذب و سلوک کی منازل طے کرتا ہے۔ بلھے شاہ اپنی شاعری میں شاہ حسین کی طرح مقامی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔

نمونہ کلام

بُلھیا کیہ جاناں میں کون؟

نہ میں مومن وچ مسیتاں　　نہ میں وچ کفر دی ریت آں
نہ میں پاکاں وچ پلیت آں　　نہ میں موسیٰ نہ فرعون
بُلھیا کیہ جاناں میں کون؟
نہ میں وچ پلیتی پاکی　　نہ وچ شادی نہ غمناکی
نہ میں آبی نہ میں خاکی　　نہ میں آتش نہ میں پون
بُلھیا کیہ جاناں میں کون؟
نہ میں بھیٹ مذہب دا پایا　　نہ میں آدم حوا جایا
نہ کچھ اپنا نام دھرایا　　نہ وچ بھٹیں نہ وچ بھون

بُلھیا کیہ جاناں میں کون؟

اول آخر آپ نوں جاناں　　نہ کوئی دوجا ہور پچھاناں

میتھوں ودھ نہ کوئی سیاناں　　بُلھا اوہ کھڑا ہے کون

بُلھیا کیہ جاناں میں کون؟

ترجمہ:

بلھیا کیا جانوں کہ میں کون ہوں؟ نہ میں پاک نمازی مومن ہوں اور نہ ہی کفر کے راستے پر چلنے والا ہوں نہ میں نیک لوگوں میں سے ہوں نہ ہی گناہگار ہوں۔ نہ موسیٰ ہوں اور نہ فرعون بلھا کیا جانوں کہ میں کون ہوں؟۔ نہ میں گناہگار ہوں اور نہ ہی بے گناہ، میں خوش ہوں نہ دُکھی۔ نہ خاک سے ہوں نہ پانی سے ہوں۔ نہ ہوا سے اور نہ آگ سے ہوں بلھا کیا جانوں کہ میں کون ہوں؟ نہ تو میں مذہب کو سمجھ سکا ہوں کہ یہ فرقے کیوں پیدا ہوئے، میرا نفس آدم اور حوا کا پیروکار بھی نہیں، میں کسی دوسرے کو نہیں پہچانتا، مجھ سے بڑھ کر کوئی عقلمند نہیں، بلھیا کیا جانوں کہ میں کون ہوں؟

بلھے شاہؒ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان کا نفس اللہ کی ذات کا ہی نور ہے بلھے شاہ نے شادی نہیں کی تھی اور اپنی ذات کو ذات الٰہیٰ میں مدغم کر لیا تھا۔

بلھے شاہ کا کلام سب سے پہلے انور علی روہتکی نے قانون عشق کے نام سے 1889ء میں شائع کیا۔ 1940ء میں کلیات بلھے شاہ جسے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے مرتب کیا پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس میں 184 کافیوں کے علاوہ دوہڑے، گنڈھاں، سی حرفیاں، اٹھوارے، اور بارہ ماہے شامل ہیں۔

6.6 سید وارث شاہؒ:

سید وارث شاہؒ پنجابی زبان کے عظیم ترین اور شہرہ آفاق شاعر ہیں۔ ان کی ہیر ایک لافانی تخلیق سے جسکا شمار ادبیات عالم میں کیا جاتا ہے۔ اس کو پنجاب کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا نام دیا جاتا ہے یعنی یہ پنجاب اور پنجابی زبان کا انسائیکلوپیڈیا ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ابھی تک اس عظیم شاعر کے احوال و آثار مکمل طور پر بازیافت نہیں کیے جاسکے۔ اب تک جو معلومات ملی ہیں وہ ان کے قصیدہ بردہ شریف کے پنجابی ترجمہ اور ہیر سے اخذ کی گئی ہیں۔ قصیدہ بردہ شریف کے منظوم ترجمہ میں ترجمے کا سال اور اپنے وطن کا ذکر کرتے لکھتے ہیں:

ناؤں مصنف سید وارث، وچ جنڈیالڑے وسے

جیہڑا شیر خان غازی بدھا سبھ کو اوتھے وسے

یاراں سو بو نجا ہجری جداے ظاہر ہوئے

تاں ایہہ بیت جواہر موتی لڑی پروئے

ترجمہ:

مصنف سید وارث شاہ جنڈیالہ شیر خان رہتا ہے۔ 1152ھ میں یہ موتی پروئے یعنی منظوم ترجمہ کیا۔

آپ کا وطن جنڈیالہ شیر خان تھا۔ جو شیخوپورہ سے شمال جنوب میں آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ نے 1152/1739 میں قصیدہ بردہ شریف کا ترجمہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 19 سال کے قریب ہو گی۔ اس طرح اُن کا سن پیدائش 1718ء بنتا ہے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں سے حاصل کی پھر وہ قصور آ گئے اور وہاں مخدوم غلام مرتضیٰ قصوری سے ظاہری علم حاصل کیا، اس بات کا اشارہ ہیر سے ملتا ہے:

وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے داتے شاگرد مخدوم قصور دا ای

ترجمہ:

وارث شاہ جنڈیالہ کا رہنے والا ہے اور مخدوم قصور کا شاگرد ہے۔

علومِ ظاہر حاصل کرنے کے بعد وہ پاک پتن شریف میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے مزار پر پہنچے اور باطنی علم حاصل کیا۔ بعض لوگوں نے بھاگ بھری کی ایک داستان کو اُن کے ساتھ منسوب کیا ہے مگر واضح شواہد کی غیر موجودگی کی وجہ سے اُسے فرضی بھی گردانا جاتا ہے۔

وارث شاہ نے اس پُر آشوب دور میں ہوش سنبھالا، جب سرزمینِ پنجاب زبوں حالی کا شکار تھی، اس ذی شعور شاعر نے بڑے غم ناک انداز میں اپنے دور کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی پستی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ملاؤں اور قاضیوں کی ریاکاری اور منافقت کا پردہ چاک کیا ہے۔ اٹھارویں صدی کا یہ زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے نظام مملکت درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس منظر نامے کو وارث شاہ نے ہیر میں سمو کر تاریخ کو امر کر دیا:

تُسیں جوگ دا پنتھ بتاؤ سانوں شوق جاگیا حرف نگینیاں دے
ایس جگ دے پنتھ وچ آوڑیاں چُھپن عیب ثواب کمینیاں دے
جرص اگ تے فقر دا پوے پانی جوگ ٹھنڈ گھتے وچ سینیاں دے
اک فقر ہی رب دے رہن ثابت ہور تھڑ کدے اہل خزینیاں دے

ترجمہ:

اے ناتھ آپ مجھے جوگ کا پنتھ بتائیں طریقہ کار سمجھائیں، میرے دل میں جوگی اور فقیر بننے کا، نگینے کے حرفوں کی طرح سے ایک شوق سا بھر آیا ہے۔ جب کوئی ناقص اور بے کار انسان، گنہگار آدمی اس جوگ پنتھ

میں آتا ہے، فقیر بن جاتا ہے تو اس کے سارے عیب و ثواب چھپ جاتے ہیں۔ جب حرص و ہوا کی جلتی آگ پر فقر و جوگ کا پانی پڑتا ہے تو سینے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ یہ فقیر / جوگی اپنے کیے عہد پر کاربند رہتے ہیں ورنہ وہ لوگ جو خزانوں اور حکومتوں کے مالک ہوتے ہیں 'ہر پل وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں اور اپنے عہد سے پھرتے رہتے ہیں۔

وارث شاہ نے اپنی لافانی تخلیق ہیر کو 1180 میں ملکہ ہانس پاک پتن میں تکمیل کو پہنچایا۔ وارث شاہ کی ہیر آج بھی ہر عہد کے لوگوں میں مقبول ہے۔ یہ رومانوی داستان پنجابی علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا خزانہ ہے، یہ وہ شاہکار تحریر ہے جسکا جواب آج تک پیدا نہیں ہو سکا، وارث شاہ سے پہلے بھی بہت سے شعرا نے قصہ ہیر لکھا اور ان کے بعد بھی بہت سے شعرا نے اس کہانی کو منظوم کیا لیکن وارث شاہ کا شاعرانہ فن سب سے بڑھ کر ہے۔ وارث شاہ پنجابی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے، ان کے ہاں الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ تھا جسے وہ خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں، کلام میں سادگی، صفائی، حقیقت پسندی اور اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ تشبیہات و استعارات، محاورات اور ضرب الامثال کو ضرورت کے مطابق اشعار میں استعمال کیا گیا ہے۔ بیان میں واقعیت، سوزو گذار اور جذبات کا خلوص جھلکتا ہے۔ وہ جس کردار کو پیش کرتے ہیں اسی روپ میں ڈھل جاتے ہیں چنانچہ جب وہ جوگی کا کلام پیش کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی جوگی بول رہا ہے، جب چرواہا مخاطب ہوتا ہے تو وارث شاہ چرواہے کا انداز اپنالیتا ہے، اسی طرح قاضی، گاؤں کی لڑکیوں، عورتوں اور جاٹوں کی زبان میں ویسے ہی بولتے ہیں جیسے کردار خود بول رہا ہو۔ وارث نے موزوں الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ وارث شاہ نے پنجاب کی ٹھیٹھ زبان میں یہ کتاب لکھی ہے، اس میں بڑی تازگی ہے اسمیں ہر قاری کو اپنے مطلب کی باتیں مل جاتی ہیں، قاری اُن کی صنعت کاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وارث شاہ نے یہ قصہ ڈرامائی روپ میں پیش کیا ہے اور تمثیل کا رنگ دیا ہے۔ ہیر کے آخر میں وارث شاہ اس قصے کو عشقِ حقیقی کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وارث شاہ نہ صرف انسانی فطرت کا نبض شناس ہے بلکہ وہ قدرتی مناظر کی تصویر کشی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اُس کے بہت سے مصرعے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

- اے جگ مقام فنا دائے سبھاریت دی کندھ ایہہ جیونا ایں
- بھائی مرن تاں پوندیاں بجھ بانہاں بناں بھائیاں پر ہے پروار ناہیں
- گنگا ہڈیاں مڑ دیاں نہیں گئیاں وقت گئے نوں پھیر کس موڑیائی
- ناہی وسدے مینہ جو گجدے نی

ترجمہ:

- یہ دنیافانی ہے، یہ زندگی ریت کی دیوار کی مانند ہے۔
- بھائی دنیا سے چلے جائیں تو ایسے ہے جیسے انسان کے بازو ٹوٹ جاتے ہیں۔ بھائیوں کے بغیر خاندان سونے ہو جاتے ہیں۔
- ہندو مذہب کی تلمیح استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گنگا میں جب راکھ بہائی جاتی ہے تو پھر کبھی ہڈیاں واپس نہیں آتیں اسی طرح گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آسکتا۔
- جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

6.7 میاں محمد بخشؒ:

میاں محمد بخشؒ میر پور، آزاد کشمیر کے علاقے کھڑی شریف کے گاؤں چک ٹھاکرا میں 1246ھ/1830ء میں پیدا ہوئے اور وہیں 1324ھ بمطابق 1907ء کو وفات پائی۔ آپ کو پیر شاہ قلندر کے مزار کے پاس دفن کیا گیا۔ آپ سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے۔ ان کے جد امجد بابا دین محمد کو حضرت غازی قلندر پیرے شاہ عرف دمڑی والا نے گود لیا، بعد میں دربار کی سجادہ نشینی کا سلسلہ میاں صاحب کے والد میاں شمس الدین تک پہنچا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم درسگاہ سموال شریف میں حاصل کی، یہ اس وقت کی مشہور درسگاہ تھی۔ انھوں نے عربی فارسی پر عبور حاصل کیا اور علوم شرعی میں بلند مقام پیدا کیا۔ آپ حضرت سائیں غلام محمد ساکن کلروڑی کے مرید تھے۔ مرشد کے حاکم سے آپ نے حضرت شیخ احمد ولیؒ سے بھی باطنی فیض حاصل کیا۔ آپ کے کشف و کرامات کی شہرت کی وجہ سے حاکم کشمیر پرتاب سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی امر سنگھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کے نذرانے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور حق سچ کا پرچار کرنے لگے۔

میاں محمد بخشؒ کو شاعری کا بچپن سے ہی شوق تھا جس کو انہوں نے اظہار کا ذریعہ بنایا، اکثر خط و کتابت بھی شاعری میں کرتے۔ آپ بڑے عالم بزرگ، صوفی اور درویش تھے۔ ان کے روحانی اشعار انسانیت کی راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پیش کرتے ہیں اسی لیے اُنہیں شاعرِ اخلاق بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔

میاں صاحب کی ہر تحریر و تصنیف ادبی و شعری محاسن سے لبریز ہے۔ وہ صنعتوں کے استعمال سے قاری تک اپنا پیغام موثر طریقے سے پہنچاتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں درج ذیل رسالے اور کتب شامل ہیں:

1۔ سوہنی مہینوال 1273ھ: شاعرانہ زندگی کے آغاز کی یہ تصنیف عشق حقیقی اور عشق مجازی کی ایک ابتدائی کڑی ہے، وحدت الوجود کے گہرے تعلق سے وہ ہر ذرہ کائنات میں محبوبِ حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

2۔ تحفہ میران 1274ھ: اس میں میاں صاحب حضرت غوث اعظم کے کمالات اور کرامات عقیدت سے بیان کرتے ہیں۔

3۔ قصہ شیخ صنعاں 1274ھ: اس میں شیخ صنعان کی غوث اعظم سے روگردانی کے بعد ایک غیر مسلم عورت کے دام میں گرفتار ہونے کی حالت کا بیان ہے۔

4۔ نیرنگ عشق 1275ھ: یہ غنیمت کنجاہی کی فارسی مثنوی نیرنگ عشق کا پنجابی ترجمہ ہے۔

5۔ شریں فرہاد 1276ھ: اس قصے کی بنیاد نظامی اور امیر خسرو کی روایات پر رکھی گئی ہے لیکن کہانی کے واقعات میں تبدیلیاں کی گئیں ہیں اور تفصیلی بیان سے گریز کیا گیا ہے۔

6۔ سیف الملوک 1279ھ: میاں صاحب کی شہرت کا سبب یہ معرکتہ الارا مثنوی ہے۔ یہ شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کے عشق کی داستان ہے۔ اس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں گروہ کے لوگوں کی تسکین کا سامان ملتا ہے۔ اس میں شاعرانہ کمالات کے ساتھ ساتھ موضوعات کی رنگارنگی بھی موجود ہے۔

اس کے علاوہ میاں محمد بخش کو پنجابی کا ابتدائی نقاد بھی کہا جاتا ہے انہوں نے اپنے اشعار میں پنجابی شعر اپر نرم و ملائم الفاظ میں مثبت تنقید کی ہے۔ ان کا کلام روانی، سلاست، شیرینی، جذبات نگاری، منظر نگاری، تشبہات، استعارات، تراکیب و تلازمات سے مزین ہے۔ وہ کلام میں تاثیر کے لیے دکھ درد لازمی قرار دیتے ہیں:

قصے ہور کسے اندر دکھ درد اپنے کجھ ہوون
بن پیڑاں تاثیراں ناہیں بے پیڑے کدر ووون

ترجمہ:

کسی کے دکھ میں اپنا دکھ نظر آتا ہے، بغیر سوز کے کلام میں تاثیر نہیں ہو سکتی کیونکہ جس کو درد نہیں وہ رو نہیں سکتا۔

میاں صاحب کے نزدیک شعر میں اِسرار ہونا ضروری ہے وگرنہ وہ متاثر کن نہیں ہو سکتا۔

جس وچ گجی رمز نہ ہووے درد مند ادے حالوں
بہتر چُپ محمد بخشا سُخن ایہو جیئے نالوں

ترجمہ:

جس کلام میں رموز و علائم نہ ہوں ایسے کلام سے خاموش رہنا بہتر ہے۔

نمونہ کلام:

نیچاں دی اشنائی کولوں پھل کسے نہیں پایا
ککر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

ترجمہ:

کمینے کی دوستی سے کبھی فیض حاصل نہیں ہوتا۔ کمینے آدمی سے دوستی کرنا ایسے ہی ہے جیسے کیکر کے درخت پر انگور کی بیل چڑھا کر انگور کو کانٹوں سے زخمی کر لیا جائے۔

سکھاں موجاں عیشاں اندر ہر کوئی یار کہاندا
سنگی سوجو تنگی اندر بنے پنجال دُکھاں دا

ترجمہ:

بھلے دنوں میں تو سبھی دوستی کا دم بھرتے ہیں لیکن اصل دوست وہ ہے جو برے وقت میں ساتھ دے اور دکھ بانٹے۔

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری
یار ملے دکھ جان ہزاراں شکر کراں لکھ واری
اچی جائی نیوں لگایا بنیمصیبت بھاری
یاراں باہجھ محمد بخشا کون کرے غم خواری

ترجمہ:

یہ سرسبز و شاداب باغات، چھوتی بہاریں اور لہلہالاتے ہوئے گلزار دوست کے بغیر کس کام کے ؟اگر میرا دوست مل جائے تو میرے ہزاروں دکھ دور ہو جائیں اور میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں۔ میں نے اپنے سے بڑی حیثیت والے سے پیار کر لیا ہے۔ میری جان سخت مصیبت میں پھنس گئی ہے اے محمد بخش! دوستوں کے سوا میرے غمخواری کوئی نہیں کر سکتا۔

میاں محمد بخش کا یہ شعر اُن لوگوں کی زبان پر بھی ہے جنھوں نے میاں صاحب کا نام تک نہیں سُنا۔

دُنیا تے جو کم نہ آوے اوکھے سوکھے ویلے
اوس بے فیض سنگی کولوں بہتر یار اکیلے

ترجمہ:

دنیا میں جو مشکل میں کام نہ آئے اُس دوست سے اکیلے رہنا ہی بہتر ہے۔

خود آزمائی

1۔ تصوف کی تعریف کیجیے نیز تصوف کی مختصر روایت بھی لکھیے۔

2۔ پنجابی ادب کے بابا آدم کہلائے جانے والے بابا فرید گنج شکرؒ کی تعلیمات انسانیت کے گرد گھومتی ہیں۔ بحث کیجیے۔

3۔ پنجابی زبان کے اہم صوفی شعرا کا تعارف کرایئے۔

4۔ سلطان باہو کی پنجابی شاعری تصوف کے اسرار و رموز سے بھرپور ہے۔ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

5۔ وہ کون سی خوبیاں ہیں جنہوں نے وارث شاہ کو سخن کا وارث بنایا؟

یونٹ نمبر:7

جدید پنجابی شاعری

تحریر:ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی:ڈاکٹر عائشہ رحمٰن

فہرست

	تعارف	138
	یونٹ کے مقاصد	138
7.1	جدید پنجابی شاعری کا پس منظر	139
7.2	شریف کنجاہی	139
7.3	احمد راہی	140
7.4	منیر نیازی	142
7.5	سلیم کاشر	144
7.6	عارف عبدالمتین	145
7.7	باقی صدیقی	147
7.8	روف شیخ	148
7.9	منظور وزیر آبادی	149
	خود آزمائی	150

یونٹ کا تعارف

جدید پنجابی شاعری نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر عصری مسائل، سماجی تبدیلیوں اور انسان کے داخلی احساسات کو بیان کیا ہے۔ اس نے پنجابی شاعری کو ایک نئی جہت دی ہے۔ جدید پنجابی شاعری میں شریف کنجاہی، احمد راہی، منیر نیازی، سلیم کاشر، عارف عبدالمتین، باقی صدیقی، رؤف شیخ اور منظور وزیر آبادی جیسے شعرا شامل ہیں، جنہوں نے پنجابی زبان کو نہ صرف اظہار کے نئے قرینے دیے بلکہ اسے مزید وسعت اور گہرائی بھی عطا کی۔ یہ شعرا اپنی فکر، جذبات، اور عہد کی عکاسی کرتے ہوئے پنجابی شاعری کو عصرِ حاضر کی حقیقتوں سے جوڑتے ہیں اور پنجابی زبان و ادب کو نئی جہت عطا کرتے ہیں۔ اس یونٹ میں ہم ان رجحان ساز پنجابی شعرا کے کلام کے فنی و فکری پہلوؤں کے بارے میں پڑھیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ جدید پنجابی شاعری کا پس منظر جان سکیں۔

2۔ جدید پنجابی نظم کے بانیوں شریف کنجاہی اور احمد راہی کے فن و فکر سے آگاہ ہو سکیں۔

3۔ مُنیر نیازی اور باقی صدیقی کے احوال و آثار بیان کر سکیں۔

4۔ سلیم کاشر اور عارف عبدالمتین کے کلام کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہو سکیں۔

5۔ رؤف شیخ اور منظور وزیر آبادی کی غزل کے موضوعات بیان کر سکیں۔

جدید پنجابی شاعری

7.1 جدید پنجابی شاعری کا پس منظر:

انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے ساتھ جہاں سماج میں بے پناہ تغیرات برپا ہوئے وہاں پنجابی شاعری پر بھی اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ یہی وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک نے فن و فکر کو نئے زاویوں سے متعارف کرایا۔ پنجابی شاعری میں جدید نظم کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔ اور اس میں جدید زمانے کے حالات و واقعات سمونے لگے۔ اس عہد میں مزاحمتی و سیاسی شاعری بھی کی جانے لگی اور ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنا کر پیش کیا جانے لگا۔ یہ سلسلہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی جاری و ساری رہا البتہ اس دور میں نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی لکھی جانے لگی۔ جدید نظم کے حوالے سے شریف کنجاہی، احمد راہی، باقی صدیقی، منیر نیازی وغیرہ اہم نام ہیں جبکہ غزل کے حوالے سے سلیم کاشر، رؤف شیخ اور منظور وزیر آبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

7.2 شریف کنجاہی:

شریف کنجاہی کا شمار جدید پنجابی نظم کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔ آپ 13 مئی 1914ء کو گجرات کے قصبہ کنجاہ میں پیدا ہوئے۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم فارسی کرنے کے بعد فارسی کے لیکچرار بن گئے۔ وہ بیک وقت اردو، پنجابی اور فارسی میں لکھتے رہے لیکن انہیں جدید پنجابی نظم کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس نے ان کے دل و دماغ پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ وہ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی جنگ کے امکانات کے بارے میں جان چکے تھے:

مولا خیر گزارے
جنگاں مڑ چھڑیاں کہ چھڑیاں
قوماں پھر بھڑیاں کہ بھڑیاں

ترجمہ:

اللہ خیر کرے ایسا لگتا ہے کہ جنگ چھڑنے والی ہے اور قومیں آپس میں لڑنے والی ہیں۔

یہی وہ عہد تھا جب مغربی ادب کے زیر اثر اردو اور دیگر زبانوں کا ادب بھی متاثر ہونے لگا۔ پنجابی ادب پہلے ہی رنگارنگ اصناف سے مزین تھا البتہ اب اس میں نئے موضوعات کو جدید اسلوب میں بیان کیا جانے لگا۔

شریف کنجاہی نے اپنی نظموں میں کئی موضوعات کو بیان کیا ہے جن میں انسان دوستی، امن و آشتی کا پیغام، شخصی آزادی، حب الوطنی، غربت، سیاسی و سماجی حالات، منفی معاشرتی رسم و رواج اور برصغیر کی تقسیم کے وقت ہونے والی قتل و غارت، ظلم و ستم کی کہانی اور اس پس منظر میں ہونے ولی ہجرت کی بات کی گئی ہے۔ ان کی کئی نظموں کا رنگ رومانوی فضا بھی لیے ہوئے ہے۔

سوچناواں دنیانوں کیہ وگ گئی اے
اکو جیہئ ہر پاسے اگ لگ گئی اے
لوٹیاں نیں واڈھیاں نیں جنگ نیں فساد نیں
بھیڑ دیاں پٹیاں دے سبق ہوے یاد نیں
مذہباں دی اگ وچ مذہباں نوں ساڑنا
تیویاں داستر اے نہ ماواں داای بھرم اے
وکھرا ای کڈھ لیا بندیاں نے دھرم اے
سوچناواں دنیانوں کیہ وگ گئی اے

ترجمہ:

میں سوچتا ہوں کہ دنیا کو کیا ہو گیا ہے ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے لوٹ مار کا بازار گرم ہے جنگ ہے، فساد ہے، برائیوں کا لوگوں نے سبق یاد کیا ہوا ہے، مذہب کی آڑ میں مذہب کو جلایا جا رہا ہے۔ عورتوں کا پردہ نہیں رہا اور نہ ہی ماؤں کا بھرم باقی رہا ہے۔ انسان نے انوکھا مذہب ایجاد کر لیا ہے۔ میں سوچتا ہوں دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔

پنجابی زبان کا یہ سچا سیوک 20 جنوری 2007ء کو گجرات میں ملک عدم سدھار گیا۔

7.3 احمد راہی:

شریف کنجاہی کی طرح احمد راہی کو بھی جدید پنجابی نظم کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ 12 نومبر 1923ء کو ان کا جنم امرتسر (بھارتی پنجاب) میں ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت لاہور آ گئے اور ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے۔ پنجابی میں ان کی کتاب ترنجن 1953ء میں چھپی۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصے میں عورت کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے اور دوسرے میں تقسیم ہند کے وقت ہونے والے ظلم و ستم کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ترقی پسند موضوعات کو بھی بیان کرتی ہیں۔

احمد راہی نے اپنی نظموں میں ان عورتوں یا لڑکیوں کی تصویر کشی کی ہے جو تقسیمِ ہند کے وقت ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے بعد جب اپنے گھر والوں یا رشتہ داروں کے پاس آئیں تو انہوں نے انہیں اپنانے سے انکار کر دیا:

بوہے کھلے رکھیں وے بابلا
خورے کدی پرت آیئے

ترجمہ:

اے بابل دروازے کھلے رکھنا ہو سکتا ہے کہ کبھی ہم لوٹ آئیں۔

لوک رنگ میں لکھی گئی احمد راہی کی نظموں میں بلا کی تاثیر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ احمد راہی نے لوک گیتوں کو اپنے من میں بسایا، روح میں اتارا اور پھر ان کی مہک سے اپنی نظموں کو سجا دیا۔ ان کی کتاب کا نام ''ترنجن'' ہے جو کہ پنجاب کلچر کا ایک اہم ستون ہے، ترنجن اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں نوجوان لڑکیاں اکٹھی بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہیں اور ساتھ ساتھ گنگناتی بھی جاتی ہیں۔ تب وہ سماں بندھ جاتا ہے کہ انسان بے خود ہو جاتا ہے۔ احمد راہی اپنی ایک نظم میں اس سہانے منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں:

اجے نواں نواں امبیاں نوں بور
اجے ہونٹاں وچ ان چھوہیاں کلیاں دے رس
اجے بانہواں وچ سجریاں شاخاں دی ہلور
اجے ان کھڑے پھلاں جیہی ہاسیاں دی دکھ
اجے ٹوراں وچ چڑھ دیاں پینگھاں والا زور
اجے ماہیے ٹپے ڈھولیاں دے نمے نمے رنگ
اجے دلاں وچ سدھراں داستا ستا شور
اجے ترنجناں وچ کلکیاں گدیاں دے چاء
اجے پیلیاں چ پیلاں پون سکھے نیں مور
اجے ساہواں وچ سہلیاں دے ساہواں دی ہواڑ
اجے سہیلیاں ای چن تے سہیلیاں ای چکور

ترجمہ:

ابھی آم کے درخت پر پھول کھلنا شروع ہوئے ہیں، ابھی ہونٹوں پر کلیوں کا رس ہے، ابھی بازو نرم شاخوں کی طرح ہے، ابھی مسکراہٹ آدھ کھلے پھول کی طرح ہے، ابھی چال جھولے کی مانند ہے، ابھی ماہیا، ٹپہ

اور ڈھولا (پنجابی لوک گیت) کا رنگ مدھم ہے۔ ابھی دل میں خواہشیں نہیں جاگیں، ابھی ترنجن میں پنجابی لوک رقص کیا جارہا ہے، ابھی کھیتوں میں مور ناچنا نہیں سیکھے۔ ابھی سہیلیاں ہی سانسوں میں بسی ہیں ابھی سہلیاں ہی چاند اور چکور ہیں۔

یہ نظم اُن لڑکیوں کی منظر کشی کرتی ہے جو ابھی جوانی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ رہی ہوتی ہیں اور وہ جوان جذبوں سے نا آشنا ہوتی ہیں۔

یہ اٹل حقیقت ہے کہ شاعر کے کلام میں اس کے عہد کا شعور ضرور جھلکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برصغیر کے گاؤں، گراؤں سے نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کر کے بھیجا، وہ اپنے گھر والوں سے دور پردیس چلے گے، ان ہجر کے لمحات کی عکاسی احمد راہی کی نظموں میں جابجا ملتی ہے:

ووہٹی سپاہیئے دی
اگ بال کے دھوئیں دے پچ رودے
کوئی بور پھیلا ہیاں دے
نہ کٹ بابو بھیڑے ٹکٹ جدائیاں دے

ترجمہ:

سپاہی کی بیوی آگ جلاتے ہوئے دھوئیں کا بہانا کر کے روتی ہے۔ پھولوں کی کونپلیں ہیں اے بابو جدائی کے بُرے ٹکٹ نہ کاٹو۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ احمد راہی کی نظمیں لوک گیتوں کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی نظموں میں سوز و گداز، سچے جذبات اور موسیقیت ہر ایک کو متاثر کرتی ہے۔

جدید دور کا یہ ممتاز شاعر 2 ستمبر 2002ء کو لاہور میں خالقِ حقیقی سے جاملا۔

7.4 منیر نیازی:

منیر نیازی 9 اپریل 1923ء ہر دوخاپر، ضلع ہوشیار پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے اور 26 دسمبر 2006ء کو لاہور میں وفات پائی۔ منیر نیازی آج کے عہد کا وہ شاعر ہے جس کا اسلوب سب سے جدا ہے۔ منیر نیازی نے پنجابی ادب میں علامت نگاری کی روایت کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ منیر نیازی کی علامتیں روایتی علامتوں سے بالکل جدا ہیں۔ انہوں نے یہ علامتیں پنجابی ثقافت سے مستعار لی ہیں۔ مثلاً پکیاں تھاواں (وہ جگہ جہاں آسیب ہو پنجابی کلچر میں پکی تھاں کہلاتی ہے) ڈائنیں، چڑیلیں، لال پھوار، سنج مسنجیاں کندھاں (سنسان دیواریں) اجاڑ راستے، پراسرار سفر وغیرہ۔ یہ علامتیں قاری کے لیے مبہم تھیں لیکن جب ناقدین نے ان علامتوں کی تشریح و

توضیح کی تو یہ آسان اور عام فہم بن گئیں۔ ابتدا میں یہ علامات نئے پن کی حامل تھیں، پھر بتدریج روایت کا حصہ بنتی چلی گئیں یہی وجہ ہے کہ پنجابی نظم لکھنے والے کسی نہ کسی انداز میں منیر نیازی کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔ منیر نیازی کی یہ علامات دہشت گردی، ظلم و ستم اور منفی اقدار کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جیسے وہ لکھتے ہیں۔

گھر دیاں کندھاں اتے دسن چھٹاں لال پھوار دیاں
ادھی راتیں بوہے کھڑکن ڈیناں چیکاں مار دیاں
سپ دی شوکر گونجے جیویں گلاں گجے پیار دیاں
ایدھروں اودھروں لک لک ہسن شکلاں شہروں پار دیاں
روحاں وانگوں کولوں لنگھن مہکاں باسی ہار دیاں

(اک پکی رات)

ترجمہ:

گھر کی دیواروں کے اوپر سرخ رنگ کی چھینٹیں دکھائی دے رہی ہیں۔ آدھی رات کو دروازوں پر دستک سنائی دیتی ہے یوں جیسے ڈائنیں چیخیں مار رہی ہوں۔ سانپ کی آواز یوں محسوس ہو رہی ہے جیسے کوئی پریمی رات کے اندھیرے میں سرگوشی کر رہے ہوں۔ ادھر اُدھر سے مافوق الفطرت مخلوقات دکھائی دے رہی ہیں باسی پھولوں کے ہار کی مہک روحوں کی طرح پاس سے گزر رہی ہے۔

(اک پکی رات)

بظاہر ہر تو اس نظم کو پڑھ کر جادو ٹونے کا احساس ابھرتا ہے لیکن ذرا غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سرخ چھینٹیں دراصل دہشت گردی کا ناسور ہیں اور عجیب و غریب آوازیں مفلوک الحال عوام کی ہیں اور طاقت کے نشے میں چور لوگ ان کی بے بسی کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ حکمران غریب عوام کے سامنے سے چھپ کر گزر جاتے ہیں۔ ایسے میں قبرستان ہی بے بس عوام کی جائے پناہ ہے۔

نہ صرف یہ نظم بلکہ منیر نیازی کی دیگر نظمیں بھی عہد کے تناظر میں پرکھی جائیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سانپ، چیتے، شیر وغیرہ جیسی علامات سے مراد وہ درندہ صفت انسان ہیں جن کے ہاتھوں تمام انسانی و اخلاقی اقدار زوال پذیر ہیں۔ منیر نیازی کو ڈر اور خوف کا شاعر بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ ڈر ان کا ذاتی نہیں بلکہ عوام الناس کا خوف ہے۔ وہ ایسی دنیا کا خواہاں ہے جہاں کوئی کسی کا دشمن نہ ہو جہاں امن و سکون ہو جہاں غربت، بیماری اور جہالت نہ ہو:

ایڈیاں دردی اکھاں دے وچ
ہنجو بھرن نہ دیواں
وس چلے تے ایس جہان وچ
کسے نوں مرن نہ دیواں

ترجمہ:

اتنی درد بھری آنکھوں میں آنسو نہ آنے دوں، میرا بس چلے تو اس جہان میں کسی کو مرنے نہ دوں۔

منیر نیازی کی سوچ و فکر کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب میں بھی جدت موجود ہے۔ لمبے چوڑے مضمون کو چند الفاظ اور دو تین مصرعوں میں یوں بیان کرنا کہ تشنگی کا احساس بھی نہ ہو اس کا کمال فن ہے اور یہ خوبی تب پیدا ہو سکتی ہے جب شاعر گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی قدرت رکھتا ہو۔

7.5 سلیم کاشر:

سلیم کاشر 15 اکتوبر 1933ء کو اسلام آباد، کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ نظم اور غزل کے شاعر ہیں، وہ کلاسیکی رنگ میں عہدِ جدید کے مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ آج کے مشینی دور کا المیہ ہے کہ انسان اپنی اعلیٰ اخلاقی اقدار سے دور ہوتا جا رہا ہے اور دھن دولت نئی قدر کے طور پر جگہ بنا رہا ہے۔ سلیم کاشر انہی منفی اقدار کے خلاف ببانگ دہل لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری مثبت اقدار کے احیاء کی طرف گامزن ہے کہ وہ سماج سے ان ناسوروں کا خاتمہ چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی شاعری کے ذریعے آواز بلند کرتے ہیں:

خود غرضی دی ڈونگھی قبروں نکلن دی کوشش نہ کریئے
اندروں اندری لاش دے وانگوں سڑدے جایئے، گلدے جایئے

ترجمہ:

انسان خود غرضی کی گہری قبر سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتا اور اندر ہی اندر لاش کی مانند گلتا سڑتا جا رہا ہے۔

آج کے مادہ پرست دور میں انسان محض اپنی خواہشوں کا غلام بن کے رہ گیا ہے اور اپنی غرض کے جال میں پھنس کر وہ انسانیت کے مقام سے گر گیا ہے۔ یہی وہ المیہ ہے جس کا سلیم کاشر بار بار ذکر کر کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں:

قبرستاناں وچ ہنگامہ شہراں وچ تنہائی اے
اج بندے نوں خود غرضی کیہڑی تھاں لے آئی اے

بیر اں دے لالچ نے تن دے لیڑے وی پڑواے نیں
چہرہ نال چریٹاں بھریا لوکاں پھکڑی لائی اے

ترجمہ:

قبرستانوں میں رونق اور ہنگامہ ہے، شہروں میں تنہائی کا ڈیرہ ہے آج کے انسان کو خود غرضی کس جگہ لے آئی ہے۔ لالچ نے انسان کو اندھا کر دیا ہے اور لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑک کے جا رہے ہیں۔

سلیم کاشر اس دنیا کو جنت کی مانند دیکھنا چاہتے ہیں۔ پیار، محبت اور احساس سے لبریز ان کا دل اس دنیا سے نفرت، منافقت، خود غرضی اور مادہ پرستی کا خاتمہ چاہتا ہے۔

مظلوماں لئی اپنا گھر وی دوزخ بن جاندا اے
دنیانوں فردوس بنان داوعدہ خوب نبھایا میں

ترجمہ:

میں نے تو اس دنیا کو جنت بنانے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہاں تو مظلوموں کے لیے اپنا گھر بھی دوزخ بنتا جا رہا ہے۔

سلیم کاشر کی شاعری میں آج کے انسان کا کرب پنہاں ہے جسے وہ حقیقت پسندانہ انداز میں یوں شعر کا روپ دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کے دلوں کی آواز بن جاتا ہے۔

7.6 عارف عبدالمتین:

عارف عبدالمتین پنجابی اور اردو کے منفرد شاعر ہیں۔ یہ 1 مارچ 1923ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے اور 30 جنوری 2001ء کو امریکہ میں ملک عدم سدھار گئے لیکن ان کی تدفین میانی صاحب، لاہور میں کی گئی۔ آپ کا مجموعہ کلام "اکلاپے دا مسافر" (تنہائی کا مسافر) کے نام سے چھپا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں تنہائی کو موضوع بنایا ہے جو آج کے صنعتی و میکانکی دور میں ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اس نفسا نفسی کے دور نے انسانی رشتوں ناطوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اپنے لحاتی مفادات کی خاطر انسان اپنے عزیز رشتہ داروں سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے اور ایسا گھمسان کا رن پڑتا جا رہا ہے کہ ہاتھ کو سجھائی نہیں دیتا۔ اسی المیے کو عارف عبدالمتین اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں:

میں جنگل وچ کلم کلا
میرے چار چو فیرے رُکھ
رُکھاں نال کیہ دکھڑے پھولاں
ایہناں نوں کیہ میری سار
دھرتی اتے شیر تے چیتے
لُغراں اتے پھنیر سپ

ترجمہ:

میں انسانوں کے جنگل میں تنہا ہوں، میرے چاروں جانب درخت ہیں، انسان نہیں۔ ان کے ساتھ اپنا دکھ درد نہیں بانٹ سکتا کیوں کہ ان کو میرے حال کی خبر نہیں۔ زمین پر شیر اور چیتے درندے پھر رہے ہیں اور ٹہنیوں پر زہریلے سانپ بیٹھے ہیں۔

آج کے ماحول نے یہ تنہائی کا زہر انسان کے رگ وپے میں اتار دیا ہے۔ وہ انسانوں سے بھری اس دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے اور دکھ سکھ بانٹنے کے لیے بھی کوئی دوست یار نہیں ملتا۔

تنہائی کے علاوہ دوسرا اہم موضوع ان کی شاعری میں خاندانی رشتوں کا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بیوی، بچوں، ماں باپ کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی:

میں تے سو نہیں سکدا
اک وی پل
جے توں نہ ہووے میرے نال
جے نال نہ ہوون میرے بال

ترجمہ:

میں ایک لمحہ بھی سو نہیں سکتا اگر میری بیوی ساتھ نہ ہو یا پھر میرے بچے ساتھ نہ ہوں۔

عارف عبدالمتین اردو آزاد نظم کے شاعر تھے، جب انہوں نے پنجابی میں لکھنا شروع کیا تو آزاد اردو نظم کی ہیئت اپنائی لیکن فکر کی چاشنی سے پنجابی نظم کو نیا آہنگ عطا کیا۔ شاعری کے علاوہ عارف عبدالمتین کا شمار پنجابی اور اردو کے ترقی پسند نقادوں میں بھی کیا جاتا ہے۔

7.7 باقی صدیقی:

باقی صدیقی 20 دسمبر 1908ء کو موضع سہام، ٹیکسلا میں پیدا ہوئے اور راولپنڈی میں 08 جنوری 1992ء کو دنیا فانی سے رخصت ہو گئے۔ پنجابی زبان کے پوٹھوہاری لہجے کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کی چھوٹی بحر کی نظم میں موضوعات کی فراوانی ہے اور یہ سارے موضوعات انہوں نے اپنے ارد گرد سے لیے ہیں۔ روزمرہ کی زبان میں حیات کے مختلف پہلوؤں کو جب وہ نظم میں ڈھالتے ہیں تو یہ قوس قزح پڑھنے سننے والے کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ اپنے ماحول سے تشبیہات و استعارات اخذ کر کے جب وہ کسی منظر یا صورتحال کی تصویر کشی کرتے ہیں تو عام قاری بھی بنا ذہن پر زور دیتے ہوئے نظم کے مفہوم و معنی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں بھاری بھر کم یا ذو معنی الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بڑھاپے میں تنہائی کی صورتحال یوں پیش کرتے ہیں:

گڈی لنگھ گئی　　تے پچھے رہ گیا
بھاں بھاں کرنا ٹیشن　　تے شاں شاں کرنے کن

(بڑھاپا)

ترجمہ:

گاڑی گزر گئی اور اپنے پیچھے سنسان اسٹیشن اور سائیں سائیں کرتے کان رہ گئے۔

آزادی ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کو خوشبو کے ساتھ تشبیہ دے کے باقی صدیقی نے آٹھ لفظوں میں یوں بیان کیا ہے۔

اچیاں کندھاں
ڈک نہ سکن
پھلاں نی خوشبو

(آزادی)

ترجمہ:

اونچی دیواریں پھولوں کی خوشبو کو روک نہیں سکتیں۔

شاعر لفظوں کا جادوگر ہوتا ہے اور الفاظ کے انتخاب سے وہ سماں باندھتا ہے لیکن مختصر ترین الفاظ میں بڑے سے بڑا موضوع بیان کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی لیکن باقی صدیقی انتہائی اختصار کے ساتھ یوں بیان کر جاتے ہیں کہ سمجھنے والے کا دل و دماغ بھی بوجھل نہیں ہوتا اور وہ مفہوم و معنی سے بھی روشناس

ہو جاتا ہے۔ باقی صدیقی روایات کی پاسداری کرنے والے انسان ہیں، جدید تعلیم اور شعور نے انسان کو اپنی سنہری اقدار سے دور کر دیا اور یہ روایات کے علم بردار ہیں اور اپنی نظموں میں ان روایات کے مٹنے پر نوحہ کناں ہیں:

کون آکھے، نی رانیے
توں ننگی ایں، گھر اپالے

ترجمہ:

کون کہے اے رانی تم ننگی ہو، گھاگھرا پہن لو۔

باقی صدیقی کی شاعری کی خاص بات اختصار پسندی، چھوٹی بحر میں رواں مصرعہ اور عام الفاظ میں موضوعات کی بہتات ہے۔ ان کی سوچ اور اس کے اظہار میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اس لیے باقی صدیقی کی شاعری تہذیبی و ثقافتی اقدار کی آئینہ دار بن کر زندہ رہنے کی حقدار ہے۔

7.8 رؤف شیخ:

رؤف شیخ نے 14 اگست 1932ء کو حافظ آباد میں جنم لیا اور 21 جولائی 2000ء کو لاہور میں دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ انہوں نے ہر صنف میں یعنی نظم، غزل، گیت، چومصرعہ وغیرہ میں سخن آزمائی کی لیکن ان کا شمار پنجابی غزل کے نمائندہ شاعروں میں کیا جاتا ہے۔

صنعتی و مشینی دور نے انسان سے مثبت اقدار چھین کر خود غرضی، بے حسی، تنہائی، خود غرضی اور مادہ پرستی کا تحفہ دیا، رؤف شیخ انہی پر اپنی غزلوں میں نوحہ کناں ہیں، وہ بارہا اس بات کا رونا روتے ہیں کہ انسان انسانی و اخلاقی اقدار بھول کر محض مشین کا ایک پرزہ بن گیا ہے، انسان محبتوں کا امین تھا مگر آج اس کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے، دولت کی چکاچوند نے اس کو بے حس کر دیا ہے اور پیسہ کمانے کے چکر میں وہ رشتوں سے محروم ہو گیا ہے:

بے چینیاں دے روگ نے شہراں نوں کھالیا
لبھدے نیں میرے دور دے بندے قرار نوں

ترجمہ:

بے چینی کے دکھ نے شہروں کو نگل لیا ہے۔ آج کے عہد میں انسان چین و سکون ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

رؤف شیخ کی شاعری میں سماج کی منفی اقدار کی ہرزہ سرائی کی گئی ہے۔ وہ اس کائنات سے برائی کا خاتمہ کر کے ایسی دنیا کے چاہنے والے ہیں جہاں خود غرضی اور بے حسی نہ ہو، جہاں دولت کی بجائے انسان اور انسانیت کی قدر ہو۔

جس نے سمے دی جیبھ تو گفتار کھوہ لئی
میں وی تے اوہدے جرم دے اندر شریک ساں
سچائیاں دے علم داونڈن گے چاننا
میں رؤف جو کتاب اکھر الیک ساں

ترجمہ:

میں بھی اس جرم میں شریک ہوں کہ جس نے وقت کی زبان سے گفتار چھین لی اور میرے الفاظ سچائی کی روشنی پھیلائیں گے، میں اگر ایک لفظ بھی حقیقت پر مبنی لکھوں گا۔

رؤف شیخ زمانے کی گراوٹ کا الزام آج کے انسان کو دیتے ہیں لیکن خود کو بھی بری الذمہ نہیں کرتے، وہ انسانوں سے مایوس نہیں، وہ پُر امید ہیں کہ انہی کے وجود سے سچ کی روشنی پھیلے گی جو دھرتی پر موجود خزاں کو لازوال بہار رت میں بدل دے گی۔

7.9 منظور وزیر آبادی:

منظور وزیر آبادی جدید پنجابی غزل کا وہ ستون ہیں جنہوں نے پنجابی غزل کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو الفاظ اور اسلوب کی گتھیوں میں الجھانے کی بجائے سیدھے سادے پر اثر الفاظ میں قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی غزل میں آج کے پر آشوب عہد کی کارستانیاں دور جدید کے انسان کے اس کرب کا اظہار ہے جو ترقی کے نام پر انسانیت کا مقدر بنا دیا گیا:

دغا فریب کتے مکر نفرتاں ملیاں
اساڈے دور نوں کنیاں ترقیاں ملیاں

ترجمہ:

آج کے دور نے دغا، فریب، مکر اور نفرت کے حوالے سے ترقی کی ہے۔

منظور وزیر آبادی معاشرے کے ناسوروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں، وہ خواہاں ہیں کہ اس دنیا میں پیار و محبت کی حکمرانی ہو:

محبت توں جہاں نوں آشنا کریئے
اسیں وی زندگی دا حق ادا کریئے
زمانہ یاد رکھے مرن مگروں
کوئی ایہو جیہا آج سلسلہ کریئے

ترجمہ:

ہمیں زندگی کا حق ادا کرنا ہے تو اس جہاں کو محبت سے روشناس کرایا جائے۔ کوئی ایسا کام کرنا چاہئے کہ انسان کے مرنے کے بعد زمانہ اسے یاد رکھے۔

قصہ مختصر کہ منظور وزیر آبادی کی غزل فنی و فکری حوالے سے بہت اعلیٰ ہے۔ وہ مختصر الفاظ اور چھوٹی بحر میں قاری کے دلوں کی تاروں کو ہلا دیتے ہیں اور یہی ان کا کمال فن ہے۔

خود آزمائی

1۔ جدید پنجابی شاعری کے اہم رجحانات قلم بند کیجیے۔

2۔ پنجابی کے جدید اہم شعرا کے احوال و آثار پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔

3۔ جدید پنجابی شاعری حالاتِ حاضرہ کی عکاس ہے۔ بحث کیجیے۔

4۔ احمد راہی اور شریف کُنجاہی کے فن و فکر کے وہ کون سے گوشے ہیں کہ ان کو پنجابی نظم کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے؟

یونٹ نمبر8:

پنجابی افسانوی ادب

تحریر: ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی واضافہ: خرم شہزاد

فہرست

یونٹ کا تعاف		153
یونٹ کے مقاصد		153
8.1	نثر	154
8.2	پنجابی افسانے کا آغاز وار تقاء	154
8.3	پنجابی ناول کا آغاز وار تقاء	163
8.4	پنجابی میں ڈارمے کا آغاز وار تقاء	166
	خود آزمائی	169

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ پنجابی افسانوی ادب سے متعلق ہے جس میں میں تین اہم اصناف نثر کا جائزہ لیا جائے گا: افسانہ، ناول، اور ڈرامہ۔ یہ تینوں اصناف پنجابی ادبی منظر نامے میں اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ یونٹ ہر صنف میں اہم تخلیقات اور مصنفین کا احاطہ کرے گا، ان کی پنجابی ادب میں شراکت اور وسیع ثقافتی تناظر پر اثرات کا تجزیہ کرے گا۔ افسانہ، ناول، اور ڈرامے کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے، طلبہ پنجابی نثری ادب کی فنکارانہ اور موضوعاتی گہرائی کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ پنجابی ادب میں نثر کی صورتحال جان سکیں۔
2۔ پنجابی ادب میں افسانے کے روایت بیان کر سکیں۔
3۔ پنجابی ادب میں ناول کی روایت سے آگاہ ہو سکیں۔
4۔ پنجابی ادب میں ڈرامے کی روایت سے روشناس ہو سکیں۔

پنجابی افسانوی ادب

8.1 نثر:

"نثر" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے "پھیلانا"، "منتشر ہونا یا" بکھیرنا"۔ ادب میں "نثر" سے مراد ایسی زبان ہے جو سیدھی، سادہ اور بغیر کسی شعری پابندی کے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ لفظ ادب میں اس اندازِ بیانکے لیے استعمال ہوتا ہے جہاں خیالات کو آزادانہ اور رواں انداز میں سپردِ قلم کیا جاتا ہے۔

نثر کی مختلف اقسام ہو سکتی ہیں جیسے کہ افسانوی نثر مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ۔

غیر افسانوی نثر مثلاً مضمون، مقالہ، انشائیہ، سوانح، تاریخ اور خطوط وغیرہ۔

ادب میں نثر کو عام طور پر شاعری کے مقابلے میں سیدھی سادی زبان کی صنف سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں کسی قسم کی فنی پابندیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس یونٹ میں ہم پنجابی زبان کے افسانوی ادب کی تین اہم اصناف ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے آغاز وارتقا کے بارے میں پڑھیں گے۔

8.2 پنجابی افسانے کا آغاز وارتقاء:

افسانہ معاشرتی تفہیم کا موثر ذریعہ ہے۔ اس متنوع اور ہمہ گیر صنف کا زندگی سے رشتہ مربوط و مضبوط ہے۔ افسانے نے اپنی منفرد خصوصیات کے باعث بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ افسانہ نگاروں نے حقائق حیات اور واقعات زندگی کی مدد سے اس صنف کو توانائی اور تاب ناکی عطا کی ہے۔ افسانہ نگار اپنے دور کی سماجی، سیاسی اور معاشی سرگرمیوں، تاریخی تغیرات اور زندگی کے تلخ و شیریں رنگوں کا ذکر فنی بصیرت اور خلوص کے ساتھ کرتا ہے۔ افسانہ لکھنے والا زندگی کے پھیلے ہوئے کینوس میں سے کسی ایک جزو یا پہلو پر توجہ مرتکز رکھتا ہے۔ لیکن روکھے پھیکے انداز میں معروضیات زندگی پیش کرنے کے بجائے فنی نزاکتوں کا خیال رکھتا ہے۔ افسانہ نگار اشاروں اور کنایوں کی مدد سے بخوبی کام لیتا ہے۔

نثری ادب میں افسانہ، خاکہ، ناول، ڈرامہ، آپ بیتی سوانح عمری، سفر نامہ، انشائیہ، داستان غرض یہ کہ متعدد انداز سے قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ نثر کے یہ تمام پہلو معاشرت کے عکاس ہوتے ہیں۔ افسانہ ان میں سے ایک اہم اسلوبِ بیان ہے۔ افسانے کا لغوی مطلب اظہر الغات میں افسانے کا لغوی مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے: "افسانہ، قصہ کہانی، داستان، چھوٹی بات، سرگزشت، ذکر اذکار، چرچا، افسانہ چھیڑنا، قصہ شروع کرنا۔"

افسانے کی تعریف مختلف مفکرین نے مختلف اوقات میں مختلف علاقوں اور مختلف قوانین سے کی ہے۔ اس طرح ماہرین و مفکرین افسانہ نے تقریباً ایک جیسی تعریف کر کے افسانے کو ادب میں ایک منفرد مقام دلایا ہے۔ ایچ

جی ویلز افسانے کے بارے اپنے خیالات کا اظہار کرتے لکھتے ہیں: "وہی مختصر افسانہ کامیاب افسانہ کہلائے گا جو قاری کے دل میں خوشی، غم یا خوف کے جذبات پیدا کر سکے یا اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کر سکے۔"

پنجابی افسانے یا کہانی کو "گلپ" کہتے ہیں۔ گلپ ایک ہندی لفظ ہے جو بنگالی زبان سے لیا گیا ہے۔ انگریزی میں اسے Short Story کہتے ہیں۔ یہ پہلے بنگالی میں لکھی گئی، بنگالی سے ہندی میں آئی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کہانی یا داستان انگریزی سے اردو اور پھر پنجابی میں منتقل ہوئی۔ لیکن اس میں کچھ اختلاف ہے۔ پنجاب میں خاص طور پر قدیم ایام سے بوڑھی عورتیں اپنے بچوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھیں جو ان کی تعلیم و تربیت میں ممد و معاون ہوتیں۔ ہمارے ملک میں فارسی کا اثر بہت نمایاں ہے۔ سعدی کی گلستان اور بوستان، کلیلہ و دمنہ، انوار اپنی داستانوں کے عمدہ مجموعے ہیں۔ جو سالوں سے ہمارے اسلامی مدارس میں پڑھائے جاتے رہے۔ کہانیوں کا دوسرا دور انگریزی عہد میں شروع ہوتا ہے۔ انگریزی میں مشہور کہانی کار ایڈگر ایلن پو، سمرسٹ ماہام اور موپساں اس موضوع کے لیے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

پنجابی میں تقسیم ہند و پاکستان سے پہلے پنجابی افسانے کے متعلق اقبال صلاح الدین "لعلاں دی پنڈ" میں لکھتے ہیں:

> "ایہہ یقین نال نئیں آکھیا جاسکدا اپئی انسان نے پہلی وار کیہ کہانی پائی سی؟ پر ایہ پک اے پئی جد انسان نوں بولن لئی زبان، واقعات نوں چیتے رکھن لئی یادداشت تے قوتِ مشاہدہ ملی تد ای اوہنے کہانی نوں جنم ڈتا۔ ایسے پاروں اسیں دیکھنے آں پئی انسان دیاں مڈھلیاں کہانیاں اوہدے آے دوالے کھلری ہوئی زندگی جہیدے نال واہ پیندا سی، بارے نیں زمین، پُسو، پنچھی، پہاڑ، ندیاں وغیرہ۔ ایناں وچ اوہناں نوں دسیا ہوندا اے، جنہاں نال مڈھلے انسان نوں پیر پیر تے پنڈ ناپیا سی۔"

ترجمہ:

یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ انسان نے پہلی مرتبہ کہانی کی کون سی قسم کہی؟ یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان کو بولنے کے لیے زبان، واقعات کو ذہن نشین کرنے کے لیے یادداشت اور قوت مشاہدہ ملی تو اس نے کہانی کو جنم دیا۔ ایسے میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی ابتدائی کہانیاں اس کے ارد گرد بکھری زندگی جس کے ساتھ اس کا واسطہ ہے، کے بارے میں ہیں۔ جیسے زمین، حشرات الارض، پنچھی، پہاڑ، ندیاں وغیرہ جس میں ان مشکلات کو بتایا گیا جن میں ابتدائی انسان کو قدم قدم پر بٹنا پڑا۔

دنیا بھر کے عالم اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے پہلی کہانیاں جو کتابوں کی صورت میں سامنے آئیں وہ "سپت سندھو" یعنی مغربی پاکستان کے اس علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جسے کل تک پنجاب کہا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ سے کم از کم دو ہزار سال پہلے رگ وید میں رچا جا چکا تھا۔ اس میں دنیا کی پیدائش اور بہت سی کہانیاں ہیں جن کے بارے میں عالموں کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی لوک کہانیاں ہیں جنہیں رگ وید میں اکٹھا کر دیا گیا اور یہی کچھ اتھر وید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے باب "کنتاپ سوکت" میں اس وقت کے لوک گیت اکٹھے کیے گئے ہیں۔ ویداں کے بغیر "اپنشداں" کی پیدائش ہوئی۔ ان میں کہانیوں کے ذریعے زندگی کے فلسفے، حق کی تلاش اور روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی۔

جہاں تک پنجابی کہانی کا تعلق ہے دوسری کئی اصناف کی طرح اس کی شروعات بھی مذہبی ضروریات کے تحت ہوئی۔ انگریزوں نے یہاں قبضہ کرنے کے لیے اپنے مذہب کے پرچار کے لیے بہت سارے حربے استعمال کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ تبلیغ مقامی زبان میں کی جائے۔ چنانچہ چھوٹی کتابوں (جن کی تعداد سو سے زیادہ بنتی ہیں) کے علاوہ 1877ء میں پنجاب ریلجس بک سوسائٹی نے "بائبل دیاں کہانیاں" ایک مجموعہ شائع کیا۔ جب یہ سلسلہ چل نکلا تو مقامی لوگوں نے اس کے رد عمل کے طور پر اپنی مذہبی کہانیاں چھاپنا شروع کر دیں۔

پنجابی میں کہانی لکھنے کا رواج 1921ء میں لال سنگھ نے "کملا کالی" سے شروع کیا۔ ابتدائی افسانہ نگاروں کے بارے روایت پر عمل کرتے ہوئے بھائی ویر سنگھ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جنہوں نے مذہبی اور تاریخی بنیاد پر اس دیورا کو تعمیر کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد 1923ء اور 1924ء میں "پریتم" اور "پھلواڑی" رسالے نکلنے شروع ہوئے جو گورمکھی میں تھے۔ 1928ء میں جوشوا فضل الدین نے فارسی انداز میں "پنجابی دربار" نکالا۔

اس کے علاوہ کرنل بھولا ناتھ وارث کے رسالے "سارنگ" گورنمنٹ کالج لاہور کے راوی اور گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے "بیکن" میں کہانیاں چھپنی شروع ہو گئیں تو 1930ء کے قریب قریب کہانی کا رنگ روپ نکھرتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ 1933ء میں گوربخش سنگھ نے "پریت لڑی" کے نام سے رسالہ نکالا، نانک سنگھ اور گوربخش اس دور کے بڑے نمایاں لکھاری تھے۔ جن میں نانک سنگھ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ہنجواں دے ہار" 1934ء میں چھپا۔ اس کے ساتھ ہی جوشوا فضل الدین کے مجموعے "ادبی افسانے" "اخلاقی کہانیاں اور نکیاں کہانیاں" 1934ء، 1935 اور 1936 چھپ کے سامنے آ گئے۔ جوشوا فضل الدین کے انداز تکنیک کے اعتبار سے افسانے بہت اعلیٰ نہیں، پھر بھی اصلاحی اور اخلاقی موضوعات کی وجہ سے ان کی اپنی اہمیت بنتی ہے۔

1940ء تک پہنچتے پہنچتے پنجابی کہانی نے مغربی اثر قبول کرنا شروع کر دیا اور سنت سنگھ کرتار سنگھ اور موہن سنگھ وغیرہ نے اس اثر کے تحت زیادہ کہانیاں لکھیں۔

قیام پاکستان سے قبل جو شوافضل الدین نے پنجابی زبان میں افسانہ لکھنے کی ابتدا کی۔ اگرچہ ان افسانوں کا فنی معیار وہ نہیں جو آج کے دور میں پنجابی افسانہ نویسی حاصل کر چکی ہے۔ لیکن خشت اول کی حیثیت سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ جو شوافضل صاحب کے افسانوں کا موضوع وہ انسان ہے جو ان کے نزدیک کائنات کے حسن کا مرکز ہے۔ ان افسانوں میں انسان کو اسی مرتبے پر دیکھنے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ ان میں معاشرے کو سماجی برائیوں سے پاک رکھنے کے لیے قدرت کے اٹل اصول جس میں برائی کی سزا ضرور ملتی ہے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نسلی امتیاز کے خلاف لوگوں کے جذبات ابھارنے پر توجہ دی گئی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ان رجحانات میں پختگی آتی گئی اور اس اعتبار سے یہ روایت بڑی توانا ہے کہ اس میں فن اور حقیقت پسندی کا امتزاج پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس زبان میں لکھے جانے والے بیشتر افسانے حقیقی پس منظر اور جیتے جاگتے کرداروں پر مبنی ہیں۔

پنجابی افسانہ لکھنے والوں میں سے نواز، عبدالمجید بھٹی، انور سجاد، رشید، سلیم میمن، کہکشاں ملک، حنیف باوا، آغا اشرف اور امرتا پریتم کے علاوہ شمس نعمان، اصغر سرحدی، مقصود اختر گلشن نعمانی، صادق قریشی، محمد آصف خان، شہباز ملک، افضل پرویز، رحمٰن مرزا، سلیم خان گی، لطیف منہاس، ماجد صدیقی چوہدری محمد اکبر، نذر فاطمہ، عزیز الرحمٰن راہی، ایس ایم ارشاد محمود چوہان اکبر لاہوری اور میر تنہا یوسفی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف پنجابی افسانے کو موضوع اور فن کے اعتبار سے ایک معیار دیا بلکہ اسے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوی ادب کے ہم پلہ کرنے میں مدد دی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ "پنجابی کہانی کارناں" (کھوج پرکھ) میں لکھتی ہیں:

ترجمہ:

پاکستان اور ہندوستان میں کہانی مغربی ادب کے اثر سے آئی اس دھرتی پر پہلا افسانہ اردو میں لکھنا شروع کیا گیا۔ اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری ہیں جنہوں نے نصیر اور خدیجہ (مجموعہ مخزن، لاہور، 1903ء) لکھا تھا۔ اس تحریر میں زنانیوں کی اخلاقی اور معاشرتی بدحالی کو موضوع بنایا۔ اس کے بعد اردو کہانیاں لکھنے والوں میں منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی ہیں۔ کرنیل سنگھ کیسل (پنجابی ساہت دا اتہاس بھاگ دوجا 1972ء) میں لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے انتظامیہ کو

پنجابی زبان سکھانے کے لیے کتابیں لکھوائیں جن میں شر دھارام پوری کی کتاب "پنجابی بات چیت" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ جدید افسانوی رنگ میں نثر کی پہلی کتاب کہی جاسکتی ہے۔ یہ 1975ء میں شائع ہوئی۔

پنجابی افسانے کا ارتقاء 1951ء 1940ء کے عشرے میں دیکھنے میں آیا، جب شیخ اسلام اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی کوشش سے 1951ء میں ماہنامہ "پنجابی" لاہور، کا اجرا ہوا۔ اس کے سالنامہ 1952ء میں چودھری اکبر خان، سہیل یزدانی، صادق بھٹی چودھری امانت علی خان اور صادق قریشی کے افسانے شائع ہوئے۔ 1955ء میں اس رسالے کے مدیر ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے رسالے میں شائع شدہ افسانوں کا انتخاب "لہراں" کے نام سے شائع کیا۔ اس میں عبدالمجید بھٹی، جوشو افضل الدین، سجاد حیدر، وقار انبالوی، صادق قریشی، رفیق لودھی، شفیع عقیل، سہیل یزدانی، عالم سیاہ پوش اور مسعودہ بانو کے افسانے شائع ہوئے۔ 1958ء میں لاہور سے ماہنامہ "پنج دریا" کا اجراء ہوا۔ ماہنامہ پنجابی کے اکتوبر 1958ء کے شمارے میں عبدالمجید بھٹی کا افسانہ "ٹھیڈا" شائع ہوا جس کو بعد میں مصنف نے پھیلا کر ناول بنا دیا۔

کہانیوں کے ادوار:

پنجابی افسانے کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور 1947ء سے 1958ء تک

دوسرا دور 1959ء سے 1971ء تک

تیسرا دور 1972ء سے 2000ء

چوتھا دور 2001ء سے تاحال

کہانی کا پہلا دور 1947ء سے 1958ء:

قیامِ پاکستان کے وقت کہانی عروج پر تھی، بٹوارے نے ایک دم کہانی کو نیا موڑ دے دیا۔ ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے والوں کے ساتھ لاکھوں کہانیاں بھی پاکستان پہنچیں اور ان کے سامنے نئے نئے موضوعات آئے۔ 1950ء میں جب پنجابی اخبار اور رسائل کی اشاعت شروع ہوئی تو اردو میں لکھنے والے پنجابی افسانہ نگاروں نے اپنی مادری زبان کی طرف توجہ دی۔ ان کہانی نگاروں میں اے حمید، نجم حسین سید، انور سجاد، اسد مفتی، انیس ناگی، منیر شیخ، ڈاکٹر لئیق بابری نمایاں ہیں۔ یہ مصنفین اردو میں لکھ کر نام پیدا کر چکے تھے۔ پنجابی کہانیاں بھی اردو کی سطح پر لکھنے لگے۔ 1958ء تک کہانیاں تو لکھی جاتی رہیں مگر کہانیوں کا کوئی مجموعہ سامنے نہ آیا۔

کہانی کا دوسرا دور 1959ء سے 1971ء تک:

اس دور میں کہانی کی رفتار خاصی تیز ہو گئی کہانیوں میں نئے نئے تجربات ہونے لگے۔ ادیبوں اور شاعروں نے علامات کا استعمال شروع کر دیا۔ اس طرح کہانیوں میں رمزیت، ایمانیت اور جدید علامتوں نے جگہ پالی۔ 1958ء کے آخر اور 1959ء کے اوائل میں پنجابی مجلس لاہور، "پنجاب رنگ" نامی ایک کتاب لڑی شائع کی، جس میں انیس ناگی کی ایک "کہانی لال ہنیری" شامل ہے جو ایک علامتی کہانی ہے۔

1960ء میں حکومت کی سرپرستی میں رائٹر گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت سرکاری سطح پر ادیبوں / شاعروں اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی شروع ہوئی۔ ادیبوں شاعروں کی نمائندہ تخلیقات پر ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ پہلی بار 1962ء میں پنجابی کتابوں پر انعامات دیئے گئے۔ اس طرح نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ ابھری۔ ان میں افضل احسن رندھاوا، انور علی، آغا اشرف احمد سلیم، اختر حسین اختر، حنیف باوا، حنیف چودھری، حسین شاہد، رفعت، شہباز ملک، محمد آصف خان، شمس نعمان، شفقت سلطانہ، عبدالغفور درشن، کہکشاں ملک، منور شہزاد، منصور قیصر، منشایاد، نذر فاطمہ، نسیمہ اشرف علی، نادر جاجوی، نواز، رضیہ ناہید رضی، اور اکمل علیمی نمایاں تھے۔

پھر 1960ء میں نواز کی کہانیوں کا مجموعہ "ڈونگھیاں شاماں" چھپا۔ نواز کی کہانیوں میں رومانیت پائی جاتی ہے پھر 1962ء میں عبدالمجید بھٹی کی "دل دیاں باریاں" کے نام سے منتخب افسانوں کی کتاب شائع ہوئی۔ 1965ء میں آغا اشرف کی کہانیوں کا مجموعہ "واورولے" منظر عام پر آیا۔ 1968ء میں رفعت کی کہانیوں کا مجموعہ "اک اوپری کڑی" اور نسیمہ اشرف علی کا سکے پتر" چھپے۔ 1969ء میں حنیف چودھری کی کہانیاں "کچ دی گڈی" کے نام سے چھپیں۔ 1970ء میں ظہیر نیاز بیگی کی کتاب "میرا دیس" چھپ کر مارکیٹ میں آئی۔

کہانیوں کا تیسرا دور 1972ء سے 2000ء تک:

اس دور میں سب سے بڑی انقلابی بات یہ ہوئی کہ غیر ملکی کہانیوں کے تراجم پنجابی زبان میں ہونا شروع ہوئے۔ جن سے نئے خیالات، نئی تکنیک اور نئی علامات درآمد ہونا شروع ہو گئیں اور اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بہت سی پنجابی کہانیاں گورمکھی حروف میں تبدیل ہو کر بھارت اور دوسرے ملکوں میں چھپیں اور ساتھ ہی ہندی، فارسی اور بنگلہ زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ افضل احسن کی کہانی "رن تلوار تے گھوڑ" سلیم خان گمی کی "پانی دا پہاڑ"، حنیف باوا کی "سگریٹ رات تے ریت، حنیف چودھری کی "موم دا تھم" اور "اڈیکاں" بھارت میں شائع ہونے والے انتخاب "نویاں قلماں" میں شامل ہیں۔ 1972ء میں انور علی کی کہانیوں کا مجموعہ "کالیاں اٹاں کالے روڈ" چھپا۔ اسی سال نذر فاطمہ کی کتاب "کاغذ دی زنجیر" چھپی۔

1973ء میں کہانیوں کے تین مجموعے سامنے آئے سلیم خان گمی کا "لہو دی خشبو"، افضل احسن رندھاوا کا "رن تلوار تے گھوڑا" حسین شاہد کا "لاپریت"، شائع ہوئیں، ان کہانیوں میں انہوں نے علامتی اور تجریدی انداز اپنایا ہے۔1975ء میں "تبکے تریل دے" (آغا اشرف) سچ دے ورقے " (مشتاق باسط) اور "سکے پُتر" (اعجاز الحق) سامنے آئے۔اس کے ساتھ ہی ماہنامہ پنج دریا" نے کہانی نمبر شائع کیا۔

1976ء میں کہانیوں کے چھ مجموعے چھپے "ہسدیاں سولاں" غلام مصطفیٰ بسمل "چانن دے روپ" شفقت سلطانہ، "اکبر کہانی" اکبر لاہوری، "جہلم وگدا رہیا" خالد حسین۔ "اچی دھرتی جھکا آسماں" مسرت کلانچوی، (ہنجوتے ہیرے" عالم قاسم جلال غلام مصطفیٰ بسمل کے تاثراتی افسانوں میں اگرچہ انداز روایتی ہے مگر کہانیوں کا تانا بانا خوبصورت انداز میں بُنا گیا ہے۔ 1977ء میں صرف خالد ملک کے افسانوں کا مجموعہ "زلفاں چھلے چھلے "شائع ہوا۔ وہ ہر کہانی میں عورتوں کے حقوق کے لیے مردانہ وار لڑتی نظر آتی ہیں۔

1978ء میں عامر فہیم کی کہانیوں کی کتاب "جاگدی اکھ داخواب" چھپی۔1979ء میں کہانیوں کی دو کتابیں چھپیں اقبال صلاح الدین کی "کونج کہانی، احسن واگھا کی "تھل کرن دریا"۔ اقبال صلاح الدین کی کہانیوں میں نیلی بار کے وڈیروں کے ہاتھوں چھوٹے طبقے پر ڈھائے جانے والے مظالم کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔

1980ء میں سجاد حیدر پرویز کی کہانیوں کا مجموعہ "سوجھلا اندھاری رات دا" ملتان کی روایات کا حامل ہے۔ "اہلناتے اُڈاری" میں شاہین آراء نے نیم روحانی انداز میں گھر کی چار دیواری کے اندر عورتوں کو پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

1981ء میں کہکشاں ملک کا "چڑیاں دی موت" بابو جاوید گرجاکھی کا "بوکاٹا" حنیف باوا کا "چرخے دی موت" شائع ہوئے۔ ان کہانیوں میں عورت کی مظلومیت، جنسی واقعات اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر علامتی طریقے سے کہانی بیان کی گئی ہے۔ مس سمتھ نے 1982ء میں ایک طویل کہانی "جولی روائی" کتابی شکل میں شائع کی جو خالص مذہبی عقیدے کا پرچار ہے۔ 1983ء میں کہانیوں کی تین کتابیں بازار میں آئیں۔ "کچے کوٹھے" اقتدار واجد "اڈیک" ناپید اختر، "زندہ تصویراں" بابو جاوید گرجاکھی، "پیار دیاں ٹنگاں" محمد علی احمدانی نے لکھیں۔ ان کی کہانیوں میں سماجی الجھاو، طبقاتی تفاوت معاشرتی ہمواریوں، عورتوں کے مسائل شعوری رویے وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔1985ء،1984ء میں مندرجہ ذیل کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے۔

ایم مسعود کھدر پوش کی طویل کہانی "وچلی گل" مرزا حامد بیگ کی "قصہ کہانی" پروین ملک کی "کیہ جاناں میں کون" شفیع ہمدم کی "چنے دے اوہلے" اور عبیدہ اعظم کی منی کہانیوں کا مجموعہ "پل گھڑی دے دکھ"۔ شائع ہوئی۔ 1986ء میں کہانیوں کی سب سے زیادہ کتابیں شائع ہوئی علامتی انداز زور پکڑ گیا اور Anti

Story کی جانب توجہ بڑھنے لگی۔ جذبے کی جگہ فلسفے اور سوچ کی گہرائی نے لے لی۔ اس انداز کی مثالوں میں ستیاں اکھیا والے" ناصر بلوچ "چھلتراں' غلام رسول شوق "مٹی اتے لیک" راشد جاوید احمد "ٹٹواں پینڈا"، اخلاق حیدر آبادی "کوک" عائشہ اسلم "شہر دے سفنے" حسین شاد وغیرہ شامل ہیں۔

1987ء سے 1993ء تک کا عرصہ افسانوں میں نئے پرانے اور ملے جُلے تجربات کا عرصہ ہے۔ علامتی اور تجریدی انداز پر زور دیا گیا اور Anti Story کی روایات نے جنم لیا ہے۔ اس دور میں لکھے گئے افسانوں میں دکھوں، مصائب و آلام، معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر تو ملتا ہے۔ مگر کہیں کہیں امید کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ وحدت تاثر، جدت اور تازگی بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ اس عرصہ میں چھپنے والے افسانوی مجموعوں میں منشایاد کا "وگدا پانی"، ناصر رانا کا "ریتاں پریتاں"، مشتاق کنول کا "میں تے میں"، مہر کا چیلوی کا "بردہ فروش" اور کالے ہتھ، بابو جاوید گرجاکھی کا "ساڈی وستی"، نزہت کا "کل جگ"، وسیم گوہر کا "کھنڈر شہر دی کوک"، افضل احسن رندھاوا کا "مُنا کوہ لہور"، مدثر علی آغا کا "چٹے لیڑے میلے لوگ"، میاں نذیر کا "پلڑ پانی"، ہارون عدیم کا "کالا سچ"، شاہ سوار علی کا "کُرلاٹ"، انور علی کا "نوری"، شمس نعمان کا "شیشے دی کندھ"، ریاض سوجانوی کا "انترے"، حفیظ خان کا "ویندی رات دی شام"، غلام حسین راہی گبول کے "جگر دے پھٹ" اہم مثالیں ہیں۔ 1994ء کے سال کو کہانیوں کے لیے زرخیز سال کہا گیا ہے۔ اس سال سلیم خان گمی کا "تردے پر"، محمد شہباز خاور کا "چپ دی چیک"، مقصود ثاقب کا "سچا تلا" اور حنیف باوا کا "کہانی" شائع ہوئے۔ 1995ء میں پانچ مجموعے منظر عام پر آئے جن میں فرخندہ لودھی کا "ہر دے وچ تریڑاں"، حمید رازی کا "رُکھ ساڈے ویری" جمیل احمد پال کا "واپسی دا سفر" میر تنہا یوسفی کا سورج اگن تائیں قابل ذکر ہیں۔ فرخندہ لودھی کی کہانیاں تہذیبی شعور کی کہانیاں ہیں وہ اب تجریدی انداز اپنانے لگی ہیں۔ حمید رازی نے علامتی ڈھنگ سے کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر علامت ماحول سے لی گئی ہے کئی کہانیاں جنور کہانیوں Fable کی شکل میں ہیں۔ جمیل احمد پال کی ہر کہانی کا کردار ہمارے معاشرے کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ کہانی لکھنے کا انداز نئے رجحان کا عکاس ہے۔ ہر کہانی آخر پر ایک سوال چھوڑتی ہے۔ میر تنہا یوسفی کا انداز نو بیانیہ اور واقعاتی ہے۔ ہر کہانی کسی نہ کسی منفرد سوچ کی حامل ہے۔ اور اپنے اندر تاثر لیے ہوئے ہے۔ 1996ء اور 1997ء میں دو مجموعے سامنے آئے ہیں۔ محسن مگھیانہ کی "بھنبھیری"، عبدالرحمٰن ادب کا "اُڈیکاں"، عبدالکبیر ہاشمی کا "نواں سورج"، بابو جاوید گرجاکھی کی "سوہنی وستی" اور "ادھی رات دوپہر"، بھنبھیری" کی تمام کہانیاں جھنگوی لہجے میں لکھی گئی ہیں۔ ہر کہانی اپنے اردگرد پھیلے دکھ درد اور معاشرتی تضاد کی عکاسی کرتی ہے۔

1998ء میں پانچ مجموعے اور ڈاکٹر ناہید شاہد کی مرتب کردہ کتاب "نویں کہانی" شائع ہوئی جس میں دس لکھاریوں کے منتخب افسانے شامل ہیں۔ 1999ء میں چھپنے والی سات کتابوں میں سے الیاس گھمن کے دو مجموعے "اگلا بندہ" اور "پنڈ دی لج" کے علاوہ محسن مگھیانہ کا "انیندرے" قابل ذکر ہیں۔ بابو جاوید گرجاکھی کی کتاب "سو دا نوٹ" منی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ چوتھا 2000ء میں جو کہانی کی کتابیں سامنے آئیں ہیں ان میں عذرا وقار کی کتاب "اک آدرش وادی دی موت" بھی شامل ہے۔

کہانیوں کا چوتھا دور 2001ء سے تاحال:

2001ء میں چھپنے والے فاروق ندیم کے مجموعے "ندیم کہانیاں" میں بعض افسانے لندن کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ 2002ء میں چھپنے والے بابو جاوید گرجاکھی کے مجموعے "اک سی پنچھی" میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ 2002ء میں رسالہ سہ ماہی "پنجابی ادب" لاہور کا "کہانی نمبر" بھی شائع ہوا۔ اس سال چھپنے والے مجموعوں میں عبیدہ سید کی کتاب "فیر کیہ ہوریا" اور اکمل شہزاد گھمن کی "ایہہ کہانی نئیں"۔ قابل ذکر ہیں۔ 2003ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں رفعت کا مجموعہ "بتی والا چوک"، افضل توصیف کا "امن ویلے ملاں گے" اور زاہد حسین کا "پنجاہ ورھیاں دی اداسی خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل احمد پال نے 2004ء میں شائع ہونے والی کہانیوں کو "پنجابی کہانی 2004ء اکٹھ کا نام دیا ہے۔ علاوہ ازیں سرفراز اعوان کی "پیار کہانی"، حمید رازی کی "وھنہ" علی انور احمد کا اپنے بلد دا پیچ، عاشق کا "پُونیاں دا دھڑا، "انسان تے سپ" قابل ذکر ہیں۔ 2005ء میں میر تنہا یوسفی کی کہانیوں کا مجموعہ "تے فیر" شائع ہوا۔ ان کے اس مجموعے میں کل 37 کہانیاں شامل ہیں۔ ہر کہانی کا اندازِ بیان نرالہ اور ہر کہانی اپنے اندر ایک بہت بڑا سبق لیے ہوئے ہے۔ کرامت مغل کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "تتلی" کے نام سے 2003ء میں چھپا جب کہ دوسرا مجموعہ "توں کہانی تے میں" کے نام سے 2016ء میں منظر عام پر آیا۔ "بھائی چارے والا گھر" کے نام سے ان کا اگلا مجموعہ 2017ء میں شائع ہوا۔ "پُٹھے ٹر دے لوک" ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جو 2019ء میں شائع ہوا۔ اس عرصے میں نیلم احمد کا بشیر کی کہانیوں کا مجموعہ ہر گچھا زخمایا خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

اس دور میں پنجابی کہانیوں کے بہت سے مجموعات شائع ہو رہے ہیں اور یہ فنی و فکری لحاظ سے ترقی کر رہی ہے۔ نئے امکانات بھی روشن ہو رہے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ پنجابی کہانی کا یہ سفر اپنے پورے جوبن پر ہے۔ آج کی کہانی لکھنے والوں میں حنیف باوا، زبیر احمد، مقصود ثاقب، ناصر بلوچ، نین سکھ اور اعجاز قابلِ ذکر ہیں۔

8.3 پنجابی ناول نگاری کا آغاز وارتقاء

دنیا کی کسی بھی زبان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ کوئی بھی زبان داستانوں کے ذخیرے سے خالی نہیں ہے۔ناول کے وجود میں آنے سے پہلے رومانی قصوں کا رواج تھا یہ قصے ایسے خیالی کرداروں اور خیالی طاقتوں پر مشتمل تھے۔ جو عقل سے ماوراد کھائی دیتے تھے۔ جوں جوں انسانی تہذیب ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی نسل انسانی کا ایک قدیم جذبہ جو قصہ گوئی کی صورت میں نمودار ہوا تھا، وہ داستان حکایت وغیرہ کے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا موجودہ ناول کی صورت میں بامِ عروج کو پہنچ گیا۔ ناول اپنے وسیع تناظر اور لچکدار ہیئت کی وجہ سے زندگی کے تمام حقائق اور پیچیدگیوں کو موضوع بنانے میں کسی قدر کامیاب بھی ہوا۔ یہ کسی ایک علاقے خطے یا ملک تک محدود نہیں رہا اور ایک ایسی صنف بن گیا جس میں زبان و مکان کی آزادی اور آفاقیت پائی جاتی ہے۔

جہاں تک پنجابی زبان میں پائے جانے والے ادب کو دیکھا جائے تو اس بارے کوئی دوسری رائے دکھائی نہیں دیتی کہ ہمارا ماضی نثر کی نسبت نظم کے حوالے سے زیادہ جانا جاتا رہا۔ نثر باتوں کہانیوں کے روپ میں زندہ رہی مگر باقاعدہ جدید نثری ادب بیسویں صدی میں ابھر کر سامنے آیا، خاص طور پر ابتدا میں جو ناول لکھے گئے ان میں زیادہ ناولوں میں مذہبی رنگ اور اخلاقی فضا نمایاں نظر آئی ہے۔ ناول میں انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے حالات و واقعات کی بھرپور طریقے سے عکاسی کی جاتی ہے۔ "ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے اطالوی میں اسے ناویلا کہا جاتا ہے جس کے معنی نئی چیز کے ہیں"۔

انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو یہاں کے رہنے والوں کو ناول کی صنف سے واقفیت ہوئی۔ اس طرح سب سے پہلے ناول انگریزی میں لکھا گیا پھر اردو میں اور اس کے بعد پنجابی میں لکھا گیا۔ ناول کے ذریعے ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تفصیلاً بیان کرتا ہے۔ یہ داستان کے مافوق الفطرت واقعات کے برعکس ہے۔ کیونکہ جب انسان کا مافوق الفطرت باتوں سے دل بھر گیا تو پھر ساری باتیں شک و شبے میں پڑ گئیں اور ناول کو عروج حاصل ہوا۔ ناول کے موضوعات انسانی زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی کہانیاں ہیں، ناول میں انسان کی سماجی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ جذباتی اور نفسیاتی مسلوں کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ناول نگار اپنے ناولوں میں زندگی کے بارے میں فلسفہ بھی بیان کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کی اخلاقی و سماجی تربیت بھی کرتے ہیں۔

اگر پنجابی ناول کے آغاز وارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو پنجابی میں سب سے پہلا ناول نگار بھائی ویر سنگھ ہے۔ جنہوں نے پہلا ناول "سندری" کے نام سے لکھا۔ بھائی ویر سنگھ کے علاوہ اور بہت سے ناول نگاروں نے بہت سے ناول لکھے مگر وہ گُرمکھی رسم الخط میں لکھے ہونے کی وجہ سے عام لوگوں تک نہیں پہنچ سکے۔ بھائی ویر سنگھ کے بعد

چرن سنگھ شہید، موہن سنگھ وید اور ماسٹر تارا سنگھ نے ناول نگاری کو آگے بڑھایا۔ ان کے علاوہ نانک سنگھ، ایشور چندر نندا، ہربخش سنگھ اور میر ان بخش منہاس کے نام بھی ناول نگاروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

پنجابی ناول نگاری کے اس جدید دور میں نانک سنگھ کو سب سے اہم ناول نویس مانا جاتا ہے۔ جس کے پنتیس 35 ناول شائع ہوئے جن میں سے "اگ دی کھیڈ" "ادھ کھڑیا پھُل" اور "چٹا لہو" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ان کا ذکر انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر میں اس طرح کیا گیا ہے:

> It was however, at the hands of Nanak Singh (1897-1973) that the Punjabi Novel matured fully. He can rightly be called the father of Punjabi Novel."

اس کے بعد کے دور میں جو شوافضل الدین نے بھی چار ناول تحریر کیے جن میں "منڈے دامل"، "پتی ورتا کملا"، "پرھبا" اور "برکتے" شامل ہیں۔

میر اں بخش منہاس نے ایک ناول "جٹ دی کرتوت عرف نواب خان" لکھا۔ جس میں دیہاتی زندگی کی جھلک دکھائی گئی ہے۔

پنجابی ناول کا دوسرا دور پاکستان بننے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ناول نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ اور شاعری زیادہ کی گئی۔ پھر بھی عبدالحمید بھٹی کا ناول "ٹھیڈا" اور افضل احسن رندھاوا کا ناولٹ "دیواتے دریا" نے ناول کے میدان کو خالی نہ رہنے دیا۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید، افضل احسن رندھاوا کے بارے لکھتے ہیں: "اس دور کے سب سے اہم اور نامور پنجابی ناول نگار افضل احسن رندھاوا ہیں۔ رندھاوا نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں پنجاب کے دلیر اور سورما مردوں کے بلند حوصلے اور شجاعت کو موضوع بنایا ہے۔ قلم کے دھنی ہیں اور ناول نگاری کے میدان میں قلم بھی تلوار کی طرح چلاتے ہیں۔"

افضل احسن رندھاوا نے "دیواتے دریا" کے علاوہ "دو آبہ" "سورج گرہن، اور "ٹٹ بھج" نام کے ناول بھی لکھے۔ جو کہ پنجابی ادب میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد سلیم خان گمی کا ناول "سانجھ" 1969ء میں چھپا اور اسے رائٹر گلڈز کا ادبی انعام ملا۔ سلیم خان گمی کا دوسرا ناول "رت تے ریتا" ہے جو کہ 1990ء میں چھپا اس ناول بارے ڈاکٹر انعام الحق جاوید لکھتے ہیں:

"یہ ناولٹ اس اعتبار سے انوکھا ہے کہ اسے پنجابی کا پہلا تھرلر (Thriller) کہا جاتا ہے۔"

ظفر لشاری نے ناول "نازو اور پہاج" لکھا انہوں نے اپنے ناول میں 1947ء کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات اور واقعات کو موضوع بنایا۔

ڈاکٹر باقر کا ناول "ہٹھ" جس میں پاکستان بننے سے پہلے کے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے اور آزادی کی تحریک، فسادات اور سماجی برائیوں کو ناول کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ پھر راجہ محمد احمد کا ناول "کھیڈ مقدراں دی" 1974ء میں چھپا۔ اس ناول میں انہوں نے دیہاتی زندگی کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

آغا اشرف نے پانچ ناول لکھے جن میں "دل اک دیوا" "سکاپتر تے ہوا" مرلی تے موتیے دا پھل"، "جیب کترا" اور "سوچ سمندر" شامل ہیں۔

اعجاز الحق کا ناول "سکے پانی" جو کہ 1975ء میں چھپا اور فخر زمان کے دو ناول "ست گواچے لوگ" اور "اک مرے بندے دی کہانی" علامتی ناول ہیں۔ علامتوں کے ذریعے پنجاب کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ نادم عصری کا ناول "اک انکھی دھی پنجاب دی" 1972ء میں چھپا، یہ ناول فسادات سے جنم لینے والے ایک مسئلے پر مبنی ہے۔

رضیہ نور محمد کا ناول "بلدے دیوے" 1974ء میں چھپا یہ پاکستان بننے کے بعد پہلا ناول ہے جو کہ ایک خاتون نے لکھا ہے۔ اس ناول میں جاگیر دارانہ سماج کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں عورت کی مظلومیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "پکھیرو" جو 1976ء میں چھپا یہ ایک علامتی تحریر ہے۔ جس میں ایک گدھے کو علامت بنایا گیا ہے۔ فخر زمان کا "اک مرے بندے دی کہانی" 1977ء، احمد سلیم کا "نال میرے کوئی چلے" 1977ء، احسان بٹالوی کا "کہانی اک اجڑ دی" 1978ء غلام حسین سہیل کا "ٹاہلیاں دی چھاں" 1978ء، منظور انور قریشی کا "بولدے پتھر" اور حنیف چوہدری کا "مہندی والے ہتھ" قابل ذکر ہیں۔"

پنجابی ناول کے اگلے دور میں افضل احسن رندھاوا کا ناول "دو آبہ" 1981ء، اصغر شامی کا "پریت"، 1981ء اسماعیل احمدانی کا "چھولیاں" 1983ء، ظفر لشاری کا "پہاج" 1983ء، کہکشاں ملک کا "چکڑ رنگی مُورتی"، 1984ء نسرین بھٹی کا "گنجھل" 1984ء سجاد حیدر پرویز کا "انوکھڑے ونج عشق دے" 1985ء فخر زمان کا "بے وطنا" 1987ء، صفیہ صابری کا "سدھراں دے پُھل" 1988ء اسماعیل احمدانی کا "امر کہانی" 1988ء، اور ناصر زیدی کا "سانول" 1989ء قابل ذکر ہیں۔

جدید دور میں ارشد چہال کا "چیڑھاں دی چھاں" 1991ء، نذر حسین جانی کا "سنجاں" 1992ء، سجاد حیدر کا چیتر باغ، 1992ء، فرزند علی کا "اک چونڈھی لون دی" 1994ء، راہی گوپال کا "بھاگ سہاگ"

1994ء الیاس گھمن کا "پرانا پنڈ" 1994ء، فرزند علی کا "بھنبھل" 1995ء، صابر رضا کا ناول "دُور دُراڈے" 1994ء، منشایاد کا ناول "ٹاواں ٹاواں تارا" 1997ء، پروفیسر سردار خان کا ناول "پکی سڑک" 1995ء، علی اختر کا ناول "وتھاں سفنے کیرے" 2001ء جمیل احمد پال کا "عذاب دن عذاب راتاں" 1999ء، میر تنہا یوسفی کا "کھدو" 2002ء اور عذرا وقار کا "باگاں والے راہ" 2003ء اور فخر زمان کا "توکہ میں" 2004ء میں میر تنہا یوسفی کا ناول "کالا چانن" قابل ذکر ہیں۔

ان سارے ناولوں کا احاطہ کرنے کے بعد ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان میں کچھ ناول سوانحی ہیں کچھ پاکستان کی سماجی وسیاسی تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں۔ کچھ ترقی پسند کچھ ناول سماجی اور کچھ علامتی و روحانی ہیں۔ اگرچہ پنجابی ناول نگاری کا یہ سفر خاصا حوصلہ افزا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ایسے ناول لکھنے کی گنجائش ہے جن میں فلسفیانہ تدبر کے ساتھ ساتھ عمرانی شعور کا بھرپور اظہار موجود ہو۔

8.6 پنجابی میں ڈارمے کا آغاز وارتقاء:

ڈرامہ یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کرکے دکھانا، اصطلاحی معنوں میں "تمثیل"، "ناٹک" یا "سوانگ" پیش کرتے دکھانا ہے۔ اس کی تعریف مختلف ناقدین نے اس کی مختلف انداز میں کی ہیں۔ ڈورسن کے مطابق "ڈرامہ ایک نقالی ہے۔ جو حرکت (عمل) اور تقریر (مکالمہ) کے وسیلے سے کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم رانا اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ڈرامہ اسٹیج پر فطرت کی نقالی کا ایک ایسا فن ہے جس میں اداکاروں کے ذریعے زندگی کے غیر معمولی اور غیر متوقع حالات کے عمل میں "قوت ارادی" کا مظاہرہ تماشائیوں کے روبرو ایک متعین وقت اور مخصوص انداز میں کیا جاتا ہے۔

ڈرامہ ایک ادبی اور فنی شکل ہے جو کہانی کو مکالمات، کردار اور حادثات کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد دیکھنے والوں کو تفریح، تعلیم یا جذبات کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ ڈرامہ عام طور پر اسٹیج پر یا ٹی وی اور فلم کے ذریعے دکھایا جاتا ہے، جہاں اداکار مختلف کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں کہانی کو منسلک اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، جو دیکھنے والوں پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ ڈرامہ کے چند اہم عناصر میں اسٹیج، پلاٹ، کہانی، مکالمات، کردار، اور منظر نگاری شامل ہوتے ہیں۔ اس فن کا آغاز قدیم تہذیبوں سے ہوتا ہے، جہاں سے آج تک یہ ادبی اور فنی شکل کا ایک اہم حصہ بنی ہوئی ہے۔ ڈرامے کی تاریخ بہت قدیم ہے مصر اور چین کے ساتھ ساتھ مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان کو اس کی جنم بھومی تصور کیا جاتا ہے۔ یونانی المیے کے پہلے لکھاری اسکائی لس کا ڈرامہ The Suppliement 900 ق م میں پیش کیا گیا تھا۔ نکول کے مطابق چین میں ڈرامائی پیش کش کا

آغاز 1100 ق م میں ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدا کالی داس کے ڈرامے ''شکنتلا'' سے ہوئی، جو کہ ویدوں کے زمانے میں سنسکرت میں لکھا گیا تھا۔

انگریزوں نے 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کیا تو ساتھ ہی ادبی و ثقافتی یلغار شروع ہو گئی۔ مشنریوں کی طرف سے انجیل کی کہانیوں پر مبنی ڈرامے پیش کیے جانے لگے۔ جیسے ایس ایس نچت نے انیسویں صدی کے آخری دیے میں ''ملکہ استر'' کے نام سے بائبل کی پرانی کتھا پر مبنی ڈرامہ پیش کیا۔ دوسری طرف یورپ کے سر کردہ ڈرامہ نگاروں کی تخلیقات کے تراجم سے متعلق تھی۔ جس کے تحت شیکسپیئر، کالز دردی اور برنارڈ شاہ اور دیگر لکھنے والوں کے ڈرامے ترجمہ ہوئے۔ اس روایت کا آغاز 1899ء سے ہوتا ہے جب چرن سنگھ نے ''شکنتلا'' کو پنجابی میں ڈھال کر سنسکرت کی ناٹکی روایت کو پنجابی ادب میں متعارف کرایا۔ گورچرن سنگھ کی تحقیق کے مطابق ''دت سنگھ'' غالباً پہلا شخص تھا جس نے ''سپن ناٹک'' کے نام سے تخلیقی ڈرامہ پیش کیا مگر بھائی ویر سنگھ کے ''راجا لکھ داتا سنگھ'' کو جو کہ 1910ء میں لکھا گیا تھا اس سلسلے کی پہلی کامیاب کوشش قرار دیا گیا تھا۔

ایشور چندر نندا کا ڈرامہ ''دلھن'' پہلا ایک کرداری ڈرامہ تھا جو 1913ء میں دیال سنگھ کالج کی اسٹیج سے دکھایا گیا۔ ان کے ڈرامے ''سبھدرا'' اور ''للی داویاہ'' گورنمنٹ کالج، لاہور کی اسٹیج سے پیش ہوئے۔ اس کے بعد سردار گور بخش سنگھ، سنت سنگھ، تردکرم سنگھ کھوسلہ، سنترمین سنگھ، بلونت کارگی، اندر سنگھ چکرورتی، روشن لعل آہوجہ، امریک سنگھ، بلیر سنگھ اور دیگر لکھاریوں نے ٹھیٹھ پنجابی ڈرامے پیش کئے۔ ڈاکٹر چرن سنگھ کو ڈرامے کے میدان میں ایشور چندر نندا کا جانشین سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس نے اسٹیج کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر ڈرامے تحریر کیے۔ ان کا ڈرامہ ''انجوڑ'' 1941ء مین وائی ایم سی اے ہال میں پیش کیا گیا۔ اسکے بعد آغا اشرف کا ڈرامہ ''لام لاٹو میم شاعر'' بھی اسی ہال میں دکھایا گیا۔ ان کے بعد پرنسپل جی ڈی سوندھی نے لاہور کے لارنس باغ میں اپنی قسم کا پہلا رنگ میچ قائم کیا۔ ریڈیو کی آمد کے ساتھ ہی ڈرامے نے ایک نئی کروٹ لی اور تخلیق کاروں کو ایک نیا پلیٹ فارم مہیا ہو گیا۔ 14 دسمبر 1937ء کو انڈیا ریڈیو سے پنجابی کے ڈرامے سب سے پہلے ''دمیانی پروگرام'' میں چلنے شروع ہوئے۔ رفیع پیر کے ڈرامے ''اکھیاں (جو کہ 1938ء کو نشر ہوا) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پنجابی کا پہلا باقاعدہ ریڈیو ڈرامہ تھا۔ جس میں بہادر اور بیگے کے سچے عشق کی کہانی کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد سب سے زیادہ ڈرامے ریڈیو کے لیے لکھے گئے، اس اعتبار سے قیام پاکستان کے بعد چھپنے والی ڈراموں کی پہلی کتاب سجاد حیدر کی (ہوادے ہوکے) بنتی ہے۔ اس میں آٹھ ڈرامے ایسے ہیں جن

میں مصنف نے فنکارانہ انداز سے گہرے سماجی و انسانی دکھوں کی عکاسی کی ہے۔ ان کی دوسری کتاب "سورج مکھی" ہے جو تجسس سے بھرپور ہے۔ تجسس کو ڈرامے کی جان سمجھا جاتا ہے، سجاد حیدر کے اکثر ڈراموں میں تجسس کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ تکینک کی تازگی بھی پائی جاتی ہے۔ جس میں فلیش بیک، خود کلامی اور نیم فلسفیانہ تخلیقائی، رومانی فضا کو نمایاں اہمیت حاصل ہے ان کی کتاب "بول مٹی دیا باویا" میں پانچ ڈرامے پیش کیے گئے ہیں، جس میں وہ فرد کی اصلاح کی طرف زیادہ دیتے ہیں۔ ان کے ڈرامہ "گھگھو گھوڑے" میں طبقاتی کشمکش جبکہ "پنجرہ" میں طبقاتی اور سماجی جبر کے خلاف تمثیل پیش کی گئی ہے۔ سجاد حیدر کی چوتھی کتاب "کالا پتن" میں تصوف کی بجائے مذہب اور اسلامی تاریخ جیسے موضوعات کھائے گئے ہیں۔ المیہ اور طربیہ کا تعلق زندگی کی شگفتہ نقل سے بنتا ہے۔ آغاز اشرف کے ڈراموں اور ان کی کتاب "نماں نماں دیوا بلے" لام لاٹو، میم شاعر اور پری پیکر اس حوالے سے بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اشفاق احمد نے اپنی کتاب "ٹالی دے تھلے" میں چھ ڈرامے پیش کیے۔ ان ڈراموں میں فلسفیانہ مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ فخر زمان کی کتاب "چڑیاں دا چنبہ" میں چار ریڈیائی ڈرامے پیش کئے گئے۔ ان کے ایک ڈرامے "دن دا بوٹا" میں نئی اور پرانی سوچ کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح صوفی غلام مصفطےٰ تبسم نے "دوناٹک" نامی کتاب میں ساون رین داسفنا کے ناموں سے دو الگ الگ ڈرامے ترجمہ کئے۔ اختر کاشمیری کی کتاب "مت" میں سماجی برائیوں کو بے نقاب کر کے مثبت راہ دکھائی ہے۔ اس ڈرامے کا مجموعی مزاج فلموں کے قریب ہے۔ منو بھائی کا ٹی وی پنجابی ڈرامہ "جزیرہ" ایک بہترین کاوش تھی۔ بانو قدسیہ کا ڈراموں کا مجموعہ "آسے پاسے" کے نام سے شائع ہوا جس میں انہوں نے گھریلو مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

نواز نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے خوبصورت ڈرامے لکھے، ان کے ڈراموں کا مجموعہ ایک شام رنگی کڑی کے نام سے شائع ہوا جس میں چھ ڈرامے شامل ہیں اور یہ سارے ڈرامے مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں اوران میں زندگی کا زندگی کے حقائق کے ساتھ ساتھ رومانی فضا موجود ہے۔ نواز نے ایک اور اصلاحی ڈرامہ سونا خواب کے نام سے شائع کروایا۔ نجم حسین سید کا ڈرامہ اک رات راوی دی 1983 میں شائع ہوا اس میں انگریز افسر برکلے اور احمد خان کھرل کے درمیان ہونے والی جھڑپوں کو دکھایا گیا ہے۔ نیاز حسین لکھویرا کی کتاب کچ دی دنیا میں 7 ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے ریڈیو اور پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہو چکے ہیں۔ اس میں معاشرے کی اصلاح کے لیے چھوٹی چھوٹے چھوٹے اقدامات دکھائی گئے ہیں۔ شاہد محمود ندیم کی کتاب خصمہ کھانیاں 1993 میں شائع ہوئی۔ یہ سٹیج ڈراموں کی کتاب ہے۔ ان ڈراموں کے موضوعات عورتوں کی ازادی کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی طرح منیر نیازی نے قصہ دو بھراواں کے نام سے اپنے ڈراموں کی کتاب شائع کروائی۔

بابو جاوید گرجاکھی کی کتاب سات ڈرامے کے نام سے شائع ہوئی یہ ڈرامے انہوں نے بچوں کے لیے لکھے ہیں۔ نذر فاطمہ کے ڈرامے ست رنگ کے نام سے 1988 میں شائع ہوئے۔ نجم حسین سید نے ہاڑدے پھل، طارق عزیز نے ترٹھ، قاسم جلال نے رت رنگیلڑی، نذیر علی شاہ نے لجپال، اسلم قریشی نے رستم سہراب وغیرہ کے نام سے ڈراموں کی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ الطاف پرواز رشید، تصدق حسین، غلام شبیر رضوی، منظور عارف عبدالحق، وقار امبالوی حسن اعرافی، اے حمید، صوفی نثار، انور سجاد، یونس جاوید، مستنصر حسین تارڑ، اختر جعفری، شکیلہ جمال، سلیم خان گمی، اکرم لودھی اور کبیر انور جعفری وغیرہ نے ڈرامے لکھے۔ ڈرامے ترجمے کے ذریعے بھی محفوظ ہوا، بہت ساری دیگر زبانوں سے پنجابی زبان میں ڈرامے ترجمہ کیے گئے جس نے ڈرامے کو آگے بڑھایا۔ آج پنجابی ڈرامہ جدید ترین ادبی صنف کے حوالے سے پنجابی ادب میں موجود ہے اور اس میں مختلف موضوعات کے ساتھ ساتھ تکنیک کے حوالے سے نئے تجربات کیے جارہے ہیں

خودآزمائی

1۔ نثر کی تعریف کرتے ہوئے اس کی بنیادی اقسام بھی تحریر کیجیے۔

2۔ پنجابی ادب میں ناول کی روایت کا جائزہ لیجیے۔

3۔ افسانہ کی تعریف کرتے ہوئے پنجابی افسانے کا آغاز وارتقا تفصیل سے بیان کیجیے۔

4۔ ڈرامے کی تعریف کیجیے نیز پنجابی ادب میں ڈرامے کی روایت پر بحث کیجیے۔

یونٹ نمبر9:

پنجاب کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز

تحریر: ڈاکٹر زیب النساء
نظر ثانی و اضافہ: زبیدہ اقبال

فہرست

یونٹ کا تعارف		172
یونٹ کے مقاصد		172
9.1	تعارف	173
9.2	ٹیکسلا	173
9.3	ہڑپہ	175
9.4	ہرن مینار	176
9.5	شالامار باغ	178
9.6	بادشاہی مسجد	179
9.7	کھیوڑہ	181
9.8	قلعہ دراوڑ	182
	خود آزمائی	183

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

یہ یونٹ پنجاب کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز کے حوالے سے ایک جامع تجزیہ پیش کرتا ہے۔ پنجاب، جو کہ ایک قدیم اور تاریخی سرزمین ہے، اپنے ثقافتی ورثے، مذہبی تنوع اور تہذیبی اثرات کے لئے مشہور ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک اہم گزرگاہ رہا ہے بلکہ اس نے مختلف تہذیبوں، قوموں اور مذاہب کے ملنے کی جگہ بھی فراہم کی ہے۔ پنجاب کی تاریخ میں مغلیہ سلطنت، سکھ راج، اور برطانوی استعمار جیسے اہم دور شامل ہیں، جنہوں نے اس کی ثقافت، فنون، اور زندگی کے طریقوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس یونٹ میں آپ پنجاب کے اہم تہذیبی مراکز اور تاریخی آثار کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ پنجاب کے اہم تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز کے بارے میں جان سکیں۔

2۔ ٹیکسلا کی تاریخی اہمیت سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

3۔ ہڑپہ کی قدامت اور وہاں دریافت ہونے والی تہذیبوں کی اہمیت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔

4۔ شالامار باغ، بادشاہی مسجد اور ہرن مینار کی تعمیر و تاریخ کے بارے میں جان سکیں۔

5۔ بہاولپور میں واقع قلعہ دراوڑ کی تاریخی اہمیت سے روشناس ہو سکیں۔

پنجاب کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز

9.1 تعارف:

پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کئی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور حادثات زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ ان گم شدہ تہذیبوں کے آثار مختلف علاقوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈپل بیمز نے پوٹھوہار کے علاقے سے ایسی کھوپڑیاں دریافت کی ہیں جن کی قدامت کا اندازہ ایک کروڑ پچاس لاکھ سے دو کروڑ سال تک کا لگایا گیا ہے۔ انہی شواہد کی بنا پر کہا کہ اولین آدم نے اسی خطے میں آنکھ کھولی ہو گی۔ سرائے کھولا (ٹیکسلا) کے آثار قدیمہ سے اب تک تین تہذیبوں کا پتہ لگایا گیا ہے، پہلی تہذیب وادی سندھ کی تہذیب سے بھی قدیم ہے، دوسری کوٹ ڈیجی کی عم عصر ہے جب کہ تیسری 500 قبل مسیح کی ہے۔ اسی طرح ہڑپہ کے کھنڈرات سے بھی جو انسانی کھوپڑیاں اور ڈھانچے ملے ہیں اُن سے کم و بیش پانچ انسانی نسلی گروہوں کا سُراغ لگایا گیا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے ہڑپہ تہذیب کی قدامت کے بارے میں 4000 سے 2600 قبل مسیح کا اندازہ لگایا ہے۔ ان ماہرین کے مطابق ہڑپہ تہذیب تقریباً آٹھ بار تباہ ہوئی ہے۔ یوں پنجاب مختلف تہذیبوں کا مرکز رہا ہے اس کی تاریخ میں مغلیہ سلطنت، سکھ راج اور برطانوی استعمار کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ اس یونٹ میں ہم پنجاب کے اہم ترین تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز کا مطالعہ کریں گے۔

9.2 ٹیکسلا:

ٹیکسلا راولپنڈی سے 22 کلو میٹر دور شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ ٹیکسلا پاکستان کے صوبہ پنجاب میں واقع ایک تاریخی اور قدیم شہر ہے، جو اپنے عظیم علمی، مذہبی، اور ثقافتی ورثے کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ شہر تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ یہ نہ صرف گندھارا تہذیب کا مرکز تھا بلکہ یہاں پر قدیم تعلیمی ادارے بھی قائم تھے جہاں دنیا بھر کے طالب علم علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ٹیکسلا کی تاریخ اور اس کے آثار قدیمہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ علاقہ کئی اہم تہذیبوں اور سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔

ٹیکسلا کا ذکر قدیم سنسکرت اور یونانی تاریخوں میں بھی ملتا ہے۔ اس شہر کی بنیاد 6ویں صدی قبل مسیح میں رکھی گئی اور یہ گندھارا تہذیب کا حصہ تھا، جو اس وقت کے اہم تجارتی، علمی، اور مذہبی مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ ٹیکسلا مختلف ادوار میں مختلف سلطنتوں کے زیر اثر رہا، جن میں ہخامنشی سلطنت، سکندر اعظم کی حکومت، موریہ سلطنت، کشان سلطنت، اور آخر میں گپتا سلطنت شامل ہیں۔ ٹیکسلا کی اہمیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب

موریہ سلطنت کے بادشاہ اشوکا نے بدھ مت کو اپنایا اور اس کی تبلیغ کے لیے ٹیکسلا کو ایک اہم مرکز بنایا۔ اشوکا نے یہاں بدھ مت کے اسٹوپے اور مذہبی عمارات تعمیر کروائیں، جو آج بھی بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے مقدس مقامات سمجھے جاتے ہیں۔

ٹیکسلا قدیم دنیا کے اہم تعلیمی مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں پر دنیا بھر سے علم کے متلاشی طلباء آتے تھے تاکہ مختلف علوم میں مہارت حاصل کریں۔ ٹیکسلا کی یونیورسٹی کو اس دور کی سب سے قدیم اور عظیم درسگاہوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا، جہاں فلسفہ، علم طب، علم ہندسہ، سیاسیات، فوجی حکمت عملی، اور دیگر اہم علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ شہر مختلف علوم کی ترقی کا مرکز تھا اور یہاں کے اساتذہ اپنی تعلیمات کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور تھے۔ ٹیکسلا کی کھدائی 1913ء میں سر جان مارشل کی سربراہی میں شروع ہوئی، جس سے اس شہر کی تاریخی اہمیت اور قدیم تہذیبوں کی باقیات کا علم ہوا۔ یہاں سے کئی اہم آثارِ قدیمہ ملے ہیں، جن میں بدھ اسٹوپے، خانقاہیں، مندر، تعلیمی ادارے، اور قدیم رہائشی علاقوں کے آثار شامل ہیں۔

دھرمراجیکا اسٹوپا بدھ مت کے مقدس مقامات میں سے ایک ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بدھا کی ہڈیاں دفن ہیں۔ یہ اسٹوپا اشوکا بادشاہ نے تعمیر کروایا تھا اور یہ بدھ مت کی تعلیمات کے لیے اہم مرکز تھا۔ جونگڑھ اسٹوپا بھی بدھ مت کی تبلیغ کے حوالے سے ایک اہم مقام ہے۔ یہاں سے بدھ مت کے مقدس نوادرات اور مجسمے بھی دریافت ہوئے ہیں۔

سرکپ شہر ٹیکسلا کے کھنڈرات کا حصہ ہے اور یونانی اثرات کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ سرکپ کی گلیاں اور مکانات قدیم یونانی طرز تعمیر کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک قدیم رہائشی علاقہ تھا جہاں پر گندھارا تہذیب کے لوگ آباد تھے۔ یہاں سے کئی قدیم برتن، اوزار، اور روزمرہ استعمال کی اشیاء دریافت ہوئی ہیں۔ ٹیکسلا بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدھا کے بعد بدھ مت کی تعلیمات کو پھیلانے میں ٹیکسلا کا کلیدی کردار رہا ہے۔ یہاں سے بدھ مت کے کئی اسٹوپے، خانقاہیں، اور مجسمے ملے ہیں جو اس دور کی مذہبی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ بدھ مت کے پیروکار آج بھی ٹیکسلا میں زیارت کے لیے آتے ہیں اور یہاں موجود مقدس مقامات کی زیارت کرتے ہیں۔

ٹیکسلا کا زوال مختلف وجوہات کی بنا پر ہوا۔ 5ویں صدی عیسوی میں ہن حملہ آوروں نے اس علاقے کو تباہ کر دیا، جس کے بعد یہ شہر کبھی اپنی پرانی عظمت حاصل نہیں کر سکا۔ حملوں اور تباہیوں کے باعث یہاں کی تعلیم اور ثقافتی سرگرمیاں ختم ہو گئیں اور شہر رفتہ رفتہ ویران ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا اور اس کی عظمت ماضی کا حصہ بن گئی۔ آج ٹیکسلا ایک اہم سیاحتی مقام اور آثار قدیمہ

کی تحقیق کا مرکز ہے۔ یونیسکو نے ٹیکسلا کو عالمی ثقافتی ورثہ کی فہرست میں شامل کیا ہے، جو اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کا اعتراف ہے۔ ہر سال دنیا بھر سے سیاح اور ماہرین آثار قدیمہ ٹیکسلا کے کھنڈرات کا دورہ کرتے ہیں تاکہ اس قدیم شہر کی تاریخ کو سمجھ سکیں اور اس کی تہذیبی اہمیت کو جان سکیں۔ ٹیکسلا کا عجائب گھر بھی ایک اہم مقام ہے جہاں اس علاقے سے ملنے والی قدیم نوادرات، مجسمے، اور دیگر تاریخی اشیاء کو نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہ عجائب گھر نہ صرف ٹیکسلا کی تاریخ بلکہ پوری گندھارا تہذیب کی معلومات فراہم کرتا ہے۔

ٹیکسلا کا تاریخی ورثہ پاکستان اور دنیا کے لیے ایک اہم اثاثہ ہے۔ یہ شہر نہ صرف اپنی علمی اور تعلیمی خدمات کے لیے مشہور تھا بلکہ اس کی مذہبی اور ثقافتی اہمیت بھی بے مثال تھی۔ ٹیکسلا کی دریافت اور اس کے آثار قدیمہ نے دنیا کو ایک عظیم تہذیب کی جھلک دکھائی ہے، جو آج بھی محققین اور تاریخ دانوں کے لیے باعث دلچسپی ہے۔

9.3 ہڑپہ:

ہڑپہ ایک قدیم اور آثارِ قدیمہ کا اہم مقام ہے جو پاکستان کے ضلع ساہیوال کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے مرکزی شہروں میں سے ایک تھا، جس کا دور تقریباً4000 قبل مسیح سے 1900 قبل مسیح تک محیط تھا۔ ہڑپہ کا شہر اس تہذیب کی اعلیٰ منصوبہ بندی، فنون، اور زراعت کی ترقی کی عکاسی کرتا ہے اور آج یہ مقام دنیا بھر کے ماہرین آثار قدیمہ کے لیے تحقیق کا مرکز ہے۔ ہڑپہ کے مکانات مستطیل اینٹوں سے بنے ہوئے تھے اور اس کی گلیاں سیدھی اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کی گئی تھیں۔ گلیوں کے ساتھ ساتھ گھروں میں نکاسی آب کا منظم نظام موجود تھا، جس میں پانی کی نکاسی کے لیے زیر زمین نالے بنائے گئے تھے۔ اس منصوبہ بندی کا مقصد شہر کو صاف اور صحت مند رکھنا تھا، جو اس وقت کی شہری زندگی کی ترقی کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔

ہڑپہ کے لوگ بنیادی طور پر کسان تھے اور گندم، جو، چاول، اور کپاس کی کاشت کرتے تھے۔ ہڑپہ تہذیب میں کپاس کی پیداوار کا خاص ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ تہذیب کپاس کے استعمال اور تجارت میں بھی مہارت رکھتی تھی۔ ہڑپہ کے لوگ زراعت کے ساتھ ساتھ تجارت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے قدیم ایران، افغانستان، اور میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) کے ساتھ تجارت کے روابط قائم کیے تھے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہڑپہ ایک بین الاقوامی تجارتی مرکز تھا۔ ہڑپہ میں کاریگری اور دستکاری بہت ترقیافتہ تھی۔ یہاں مٹی کے برتن، دھات سے بنی اشیاء، مہریں، اور زیورات بنانے کا فن اپنے عروج پر تھا۔ ہڑپہ کے کاریگر مٹی، تانبے،

اور پتھر سے خوبصورت اور باریک کاریگری کی اشیاء تیار کرتے تھے۔ ہڑپہ کی مہریں خاص طور پر مشہور ہیں، جن پر مختلف جانوروں اور نشانات کی نقش کاری کی گئی ہے۔ یہ مہریں تجارتی معاملات میں استعمال ہوتی تھیں۔

ہڑپہ کی تہذیب میں لوگ اجتماعی اور منظم زندگی گزارتے تھے۔ یہاں کے معاشرتی نظام میں کسی بڑی بادشاہت یا مرکزی حکومت کے آثار نہیں ملتے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں کی زندگی زیادہ تر مقامی برادریوں کے تحت منظم تھی۔ ہڑپہ کے لوگ مذہبی لحاظ سے بھی خاصے دلچسپ تھے، کیوں کہ یہاں قدیم عبادت گاہوں یا مذہبی عمارات کے آثار نہیں ملے، لیکن لوگوں کی روزمرہ زندگی میں مذہبی علامتوں کا نمایاں کردار تھا۔

ہڑپہ کی کھدائی کے دوران جو اشیاء ملی ہیں ان میں مٹی کے برتن، چھوٹے مجسمے، مہریں، اوزار، اور زیورات شامل ہیں۔ ان میں مٹی کے بنے ہوئے جانوروں کے مجسمے اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی دریافت ہوئیہیں، جو اس دور کے بچوں کے کھلونوں کی صورت میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ انسانی مجسمے اور زیوراتہڑپہ کی کھدائی کے دوران جو اشیاء ملی ہیں ان میں مٹی کے برتن، چھوٹے مجسمے، مہریں، اوزار، اور زیورات شامل ہیں۔ ان میں مٹی کے بنے ہوئے جانوروں کے مجسمے اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی دریافت ہوئی ہیں، جو اس دور کے بچوں کے کھلونوں کی صورت میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ انسانی مجسمے اور زیورات ہڑپہ کے لوگوں کی جمالیاتی حس اور فنی صلاحیتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہڑپہ کی تہذیب کا اختتام تقریباً1900 قبل مسیح کے بعد ہوا۔ اس زوال کی وجوہات کے بارے میں کئی نظریات پیش کیے جاتے ہیں، جن میں دریاؤں کے بہاؤ میں تبدیلی، زلزلے، قدرتی آفات اور حملہ آوروں کی آمد شامل ہیں۔ تاہم، اس تہذیب کا اختتام ایک راز ہی رہا ہے اور ماہرین آثار قدیمہ اس بارے میں مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ ہڑپہ کی دریافت اور اس سے حاصل ہونے والے آثار قدیمہ نے دنیا کو ایک انتہائی ترقییافتہ اور منظم تہذیب کی جھلک دکھائی ہے، جو آج بھی محققین اور سیاحوں کے لیے باعث دلچسپی ہے۔

9.4 ہرن مینار:

مغلیہ دور میں "فنون لطیفہ" اور "فنِ تعمیر" نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ مغلیہ دور کا فن تعمیر شاندار اور منفرد تھا۔ مغل بادشاہوں نے کئی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں، جو آج بھی اپنی خوبصورتی اور مہارت کے لئے مشہور ہیں مثلاً تاج محل کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے، جو مغل بادشاہ شاہجہان نے اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ اجمیر شریف کی عظیم الشان درگاہ خواجہ معین الدین چشتی کی ہے، جس میں اسلامی فن تعمیر کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ دلّی کا لال قلعہ مغل فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ

ہے، جس میں سرخ پتھر کا استعمال کیا گیا ہے۔ شاہجہاں کے دور میں کئی عظیم عمارتیں جیسے کہ جامع مسجد شہر آگرہ میں تعمیر کی گئیں۔ مغل دور کے فنون لطیفہ اور فن تعمیر نے نہ صرف برصغیر کے ثقافتی ورثے کو مستحکم کیا بلکہ عالمی ثقافت میں بھی اپنی جگہ بنائی۔ یہ فنون آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور ان کی جمالیات کی وجہ سے آج بھی داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔ آگے ہم مغلیہ دور کے اہم ترین تاریخی آثار کے بارے میں پڑھیں گے۔

ہرن مینار ضلع شیخوپورہ پنجاب، پاکستان میں واقع ایک تاریخی مینار ہے۔ کہا جاتا ہے اس شہر کی بنیاد عظیم مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر نے رکھی۔ جہانگیر کی ماں اُسے پیار سے شیخو بابا کہتی تھی اور اسی مناسبت سے اس شہر کا نام شیخوپورہ رکھا گیا۔ ہرن مینار مغل بادشاہ جہانگیر کے دور میں 1606ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسے خاص طور پر بادشاہ کے پسندیدہ ہرن، "منس راج"، کی یاد میں بنایا گیا تھا، جو اتفاقاً شکار کے دوران تیر لگنے سے مر گیا تھا۔

ہرن مینار کا بنیادی مقصد جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے ایک مخصوص جگہ کا قیام تھا، جہاں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد شکار کے بجائے جانوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس کے ارد گرد ایک خوبصورت باغ اور پانی کا ذخیرہ بھی ہے، جسے "تالاب" کہا جاتا ہے۔

یہ مینار مغل فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور فن تعمیر کی بدولت، یہ مقام سیاحوں کے لیے ایک پسندیدہ جگہ ہے۔ یہ مینار مغل دور کی شاہی فنِ تعمیر کی ایک انمول مثال ہے۔ 100 فٹ بلند اس مینار کو سنگِ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد 40 فٹ قطر پر مشتمل ایک خوبصورت تالاب موجود ہے۔ اس تالاب کے درمیان ایک چبوترہ بنا ہوا ہے، جسے ایکپُل کے ذریعے مینار سے جوڑا گیا ہے۔

یہ مقام اس زمانے کے شاہی جنگلات اور شکار گاہوں کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ مغل بادشاہان اکثر شکار کے لیے نکلتے تھے، لیکن ساتھ ہی جانوروں کی حفاظت کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہرن مینار اسی سوچ کا عملی نمونہ تھا، جہاں شکار کم اور جانوروں کی حفاظت زیادہ کی جاتی تھی۔

آج، ہرن مینار تاریخی اور ثقافتی اہمیت کے حامل مقامات میں سے ایک ہے، جہاں ملکی اور غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ اس مقام کی پرکشش تاریخ، خوبصورت فن تعمیر، اور فطری ماحول اسے ایک بہترین سیاحتی مقام بناتا ہے۔ ہرن مینار کے ارد گرد کا علاقہ ایک وسیع شکار گاہ تھا، جسے "شاہی شکار گاہ" کہا جاتا تھا۔

بادشاہ جہانگیر نہ صرف ایک شوقین شکاری تھے بلکہ وہ قدرتی ماحول اور جنگلی حیات کی حفاظت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہرن مینار کو جانوروں، خصوصاً ہرنوں کی پناہ گاہ کے طور پر بنایا گیا تھا۔

مینار کی دلچسپ خصوصیات میں سے ایک اس کی ڈیزائننگ ہے، جو مغل دور کے دیگر تعمیراتی شاہکاروں سے مختلف ہے۔ اس کے بیرونی حصے پر پیچیدہ نقش و نگار اور مخصوص مغل طرز کی تزئین و آرائش کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص مقام تھا۔ مینار کے اوپر سے آس پاس کے علاقے کا نظارہ بہت خوبصورت ہوتا ہے، اور اس سے مغلیہ دور کی عظمت کا ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس مقام کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کے قریب ہی ایک وسیع و عریض باغ بھی تھا، جو مغل باغبانی کے اصولوں کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اس باغ میں مختلف قسم کے درخت، پودے اور پھول لگائے گئے تھے، جو اس دور میں شاہی خاندان اور درباریوں کے لیے آرام اور تفریح کا مرکز تھا۔

اس مقام کو یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثہ کے مقامات کی فہرست میں شامل کرنے کی تجویز بھی دی گئی ہے، کیونکہ یہ مغلیہ دور کے ثقافتی، تاریخی اور تعمیراتی ورثے کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ ہرن مینار مغلیہ دور کی قدرتی حیات سے محبت اور فن تعمیر میں مہارت کا ایک لازوال نمونہ ہے، جو آج بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، مقامی طور پر ہرن مینار سے کئی قصے اور لوک کہانیاں بھی منسوب ہیں، جو اسے اور زیادہ پرکشش بناتی ہیں۔ حکومت نے اس کی دیکھ بھال اور بحالی کے لیے مختلف اقدامات کیے ہیں تاکہ یہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہے۔ ہرن مینار ایک شاندار ورثہ ہے، جو اپنی تاریخ، فن تعمیر اور ثقافتی اہمیت کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے ایک دلچسپ مقام ہے جو ماضی کیبادیں تازہ کرتا ہے۔

9.5 شالامار باغ:

شالامار باغ لاہور کے مشہور باغات میں سے ایک ہے، جو مغل دور کی شاندار مثالوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ باغ 1641 میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور حکومت میں تعمیر کیا گیا، جو اپنی خوبصورتی اور فن تعمیر کی وجہ سے مشہور ہے۔ شالامار باغ کا نام فارسی لفظ "شالا" اور "مار" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے "خوبصورت باغ"۔ شالامار باغ کی ساخت تین مختلف سطحوں پر مشتمل ہے، جو کہ خاص طور پر پانی کی ندیوں اور جھیلوں کے گرد تعمیر کی گئی ہے۔ ہر سطح پر باغ کے مخصوص حصے ہیں:

اوپر کا حصہ (فردوس): یہ باغ کا سب سے اونچا حصہ ہے، جہاں خوشبودار پھول اور درخت موجود ہیں۔ یہ حصہ عوامی تفریح کے لیے کھلا ہے۔

درمیانی حصہ: اس حصے میں باغ کی زیادہ تر خوبصورتی ہے، جہاں پھولوں کے مختلف بستر اور پانی کے چشمے ہیں۔ اس حصے میں باغ کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے خصوصی فن تعمیرات کی گئی ہیں۔

نیچے کا حصہ (عطارد): یہ باغ کا سب سے نچلا حصہ ہے، جو زیادہ تر پانی کے ذخائر کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں پر چھوٹے چھوٹے تالاب اور جھیلیں ہیں، جو باغ کی خوبصورتی کو بڑھاتی ہیں۔ باغ میں پانی کا ایک خوبصورت نظام ہے، پانی باغ کی ہر سطح پر بہتا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے چشمے اور ندیوں کا استعمال کیا گیا ہے، جو باغ کی فضا کو خوشگوار بناتے ہیں۔ شالامار باغ میں فن تعمیر کی خوبصورتی نظر آتی ہے۔ یہاں کی دیواروں پر مختلف اشکال اور نقاشی کی گئی ہیں، جو اس کی ثقافتی ورثے کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہاں مختلف اقسام کے پھول، درخت اور پودے موجود ہیں، جو باغ کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔

شالامار باغ کا تاریخی پس منظر بھی کافی دلچسپ ہے۔ یہ باغ دراصل ایک تفریحی مقام تھا، جہاں بادشاہ اور اس کی بارگاہ کے افراد آکر خوشگوار لمحات گزارتے تھے۔ اس باغ میں خاص تقریبات اور محفلیں بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ آج کل شالامار باغ ایک مشہور سیاحتی مقام ہے، جہاں ہر سال ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ یہ باغ نہ صرف اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بلکہ تاریخی اہمیت کی بنا پر بھی جانا جاتا ہے۔ یہاں پر مختلف ثقافتی تقریبات، میلے اور فیسٹیولز بھی منعقد ہوتے ہیں، جو لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں۔ شالامار باغ کا دورہ کرنا لاہور آنے والے سیاحوں کے لیے ایک خاص تجربہ ہے، جہاں وہ تاریخ، ثقافت اور قدرت کی خوبصورتی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

9.6 بادشاہی مسجد:

بادشاہی مسجد، لاہور، اسلامی فن تعمیر کی ایک شاندار مثال ہے اور فیصل مسجد کے بعد یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1671ء میں ہوا اور یہ 1673ء میں مکمل ہوئی۔ یہ مسجد مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کے دور میں تعمیر کی گئی، جو اس وقت کی ثقافتی، مذہبی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم مرکز تھی۔ بادشاہی مسجد کی تعمیر کی کہانی اورنگزیب عالمگیر کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ بادشاہ نے یہ مسجد اس لیے تعمیر کروائی تاکہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم عبادت گاہ فراہم کی جاسکے۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ یہ مسجد اس دور کی دیگر مساجد سے منفرد ہو اور مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو مستحکم کرے۔

بادشاہی مسجد کا ڈیزائن اسلامی فن تعمیر کے مختلف عناصر کو ایک جگہ جمع کرتا ہے۔ یہ مسجد تقریباً 276,000 مربع فٹ کے رقبے پر واقع ہے۔ مسجد کے چاروں کونوں پر بلند مینار موجود ہیں، جو تقریباً 176 فٹ

اونچے ہیں۔ یہ مینار سرخ پتھر اور سنگ مرمر کے مرکب سے بنائے گئے ہیں۔ مرکزی گنبد خوبصورت سفید سنگ مرمر سے ڈھکا ہوا ہے، جو اپنی ساخت اور جمالیات میں منفرد ہے۔

مسجد کا صحن بہت وسیع ہے، جہاں ایک وقت میں ساٹھ ہزار لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ صحن کی زمین پر سرخ پتھر کے ساتھ مختلف خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر حیرت انگیز نقش و نگار موجود ہیں، جو قرآن کی آیات، خطاطی اور اسلامی جغرافیائی اشکال کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تمام عناصر مسجد کو ایک منفرد جمالیاتی انداز دیتے ہیں۔ بادشاہی مسجد مسلمانوں کے لیے صرف ایک عبادت گاہ نہیں بلکہ ایک ثقافتی ورثہ بھی ہے۔ یہاں ہر سال بڑے مذہبی اجتماعات، جیسے عیدین، جمعہ اور دیگر اہم دنوں پر نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ یہ مقام مذہبی لحاظ سے نہایت اہم ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

بادشاہی مسجد کی اہمیت صرف مذہبی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی ورثہ بھی ہے۔ یہ مسجد لاہور کے تاریخی شہر کا حصہ ہے اور یہاں کے مقامی لوگوں کے لیے ایک شناخت کی علامت ہے۔ بادشاہی مسجد کے گرد دیگر تاریخی مقامات جیسے کہ لاہور قلعہ اور شالامار باغ بھی واقع ہیں، جو اس کی تاریخی اہمیت کو مزید بڑھاتے ہیں۔ بادشاہی مسجد نہ صرف ایک مذہبی مرکز ہے بلکہ یہ سیاحوں کے لیے بھی ایک اہم مقام ہے۔ ہر سال لاکھوں لوگ یہاں آتے ہیں، نہ صرف نماز پڑھنے کے لیے بلکہ اس تاریخی عمارت کی خوبصورتی اور فن تعمیر کیتعریف کرنے کے لیے بھی۔ حکومت پاکستان نے اس کے تحفظ اور بحالی کے لیے مختلف اقدامات کیے ہیں تاکہ یہ عظیم الشان ورثہ آئندہ نسلوں تک محفوظ رہے۔

بادشاہی مسجد اسلامی فن تعمیر کی ایک عظیم مثال ہے اور اس کی تعمیراتی خصوصیات، تاریخی اہمیت، اور مذہبی تقدس اسے دنیا بھر میں منفرد بناتے ہیں۔ یہ مسجد نہ صرف لاہور بلکہ پاکستان کی روحانی اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی موجودگی ہمیں تاریخ کیاد دلاتی ہے۔ بادشاہی مسجد مسلمانوں کے لیے صرف ایک عبادت گاہ نہیں بلکہ ایک ثقافتی ورثہ بھی ہے۔ یہاں ہر سال بڑے مذہبی اجتماعات، جیسے عیدین، جمعہ اور دیگر اہم دنوں پر نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ یہ مقام مذہبی لحاظ سے نہایت اہم ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

بادشاہی مسجد کی اہمیت صرف مذہبی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی ورثہ بھی ہے۔ یہ مسجد لاہور کے تاریخی شہر کا حصہ ہے اور یہاں کے مقامی لوگوں کے لیے ایک شناخت کی علامت ہے۔ بادشاہی مسجد کے گرد دیگر تاریخی مقامات جیسے کہ لاہور قلعہ اور شالامار باغ بھی واقع ہیں، جو اس کی تاریخی اہمیت کو مزید بڑھاتے ہیں۔ بادشاہی مسجد نہ صرف ایک مذہبی مرکز ہے بلکہ یہ سیاحوں کے لیے بھی ایک اہم مقام ہے۔ ہر سال

لاکھوں لوگ یہاں آتے ہیں، نہ صرف نماز پڑھنے کے لیے بلکہ اس تاریخی عمارت کی خوبصورتی اور فن تعمیر کی تعریف کرنے کے لیے بھی۔ حکومت پاکستان نے اس کے تحفظ اور بحالی کے لیے مختلف اقدامات کیے ہیں تاکہ یہ عظیم الشان ورثہ آئندہ نسلوں تک محفوظ رہے۔

بادشاہی مسجد اسلامی فن تعمیر کی ایک عظیم مثال ہے اور اس کی تعمیراتی خصوصیات، تاریخی اہمیت، اور مذہبی تقدس اسے دنیا بھر میں منفرد بناتے ہیں۔ یہ مسجد نہ صرف لاہور بلکہ پاکستان کی روحانی اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی موجودگی ہمیں تاریخ کیبیاد دلاتی ہے اور یہ ہمیں اپنے ماضی سے جڑنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

9.7 کھیوڑہ:

کھیوڑہ کان جہلم کے نزدیک واقع ہے یہاں پاکستان کے مشہور نمک کے خزانے میں موجود ہیں۔ یہ کان، جو کہ ہمالیہ کی رینج کا حصہ ہے، دنیا کی عظیم نمک کی کانوں میں سے ایک مانی جاتی ہے۔ اس کان کا تعلق کھیوڑہ شہر سے ہے، جو کہ جہلم سے کچھ کلومیٹر دور ہے۔ کھیوڑہ کان کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ یہ کان پہلی بار مغل دور میں کھودی گئی تھی اور یہاں سے نمک نکالنے کا عمل شروع ہوا۔ اس کان سے نکلا نمک صرف پاکستان ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ کان نمک کی کھوج کا شاندار طریقہ تھا، جو کہ مغل سلطنت کے دور میں نمک کی ضرورت کے لئے بہت اہم تھا۔ کھیوڑہ کی کان دنیا کے کچھ خاص نمک کے خزانوں میں سے ایک ہے۔ اس کان سے ملنے والا نمک بہت ہی زیادہ خوشبودار اور بہترین ہوتا ہے۔ یہ نمک آج کل صرف کھانے میں نہیں، بلکہ علاج کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے کہ سالٹ تھراپی (نمک کی تھراپی) جہاں لوگ اس نمک سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کان میں کام کرنے والے مزدور بہت ہی محنتی اور مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں کان کی گہرائیوں میں کام کرنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے، جہاں وہ نمک کو کھینچ کر باہر نکالتے ہیں۔ کھیوڑہ کی کان بہت سی گہرائیوں تک پھیلی ہوئی ہے، اور یہاں کا ماحول تھوڑا خطرناک ہوتا ہے، لیکن مزدور اپنی مہارت اور صبر سے اس کان سے نمک نکالتے ہیں۔ کھیوڑہ کی کان صرف نمک کا خزانہ ہی نہیں، بلکہ یہ علاقے کی معیشت کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ یہاں سے ملنے والا نمک نہ صرف مقامی بازار میں بیچا جاتا ہے، بلکہ بین الاقوامی مارکیٹ میں بھی برآمد ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کھیوڑہ کی کان اب ایک سیاحتی مقام بھی بن گئی ہے۔ بہت سے لوگ اس کان کو دیکھنے آتے ہیں اور یہاں کے خوبصورت مناظر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ یہاں آکر لوگ نمک کی کھدائی دیکھ سکتے ہیں اور اس کے ماحول کا احساس کر سکتے ہیں۔ کھیوڑہ کی کان نہ صرف نمک کا ایک خزانہ ہے،

بلکہ یہ پاکستان کی تاریخ اور ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کان کی اہمیت اس کی خزانے اور علاقے کی معیشت کے لئے بہت زیادہ ہے۔

9.8 قلعہ دراوڑ:

بہاولپور کا قلعہ، جو دراصل "ڈیرم قلعہ "(Derawar Fort) کے نام سے مشہور ہے، پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع بہاولپور میں واقع ہے۔ یہ قلعہ صحرائے چولستان کے وسط میں واقع ہے اور اس کی تعمیر کا آغاز 1733 عیسوی میں ہوا تھا۔ قلعہ دراوڑ کی تعمیر نواب بہاول خان اول کے حکم پر کی گئی تھی۔ یہ قلعہ پہلے دراوڑ کے علاقے میں واقع قلعے کے دفاعی مقاصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ قلعہ کی دیواریں 30 میٹر بلند ہیں اور اس کی بنیاد کا سائز 1500 میٹر ہے۔ قلعہ کے چاروں طرف 40 میٹر بلند چوکور برج موجود ہیں، جو اس کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔

قلعہ کے اندر مختلف مقامات پر روایتی ہنر کا نمونہ موجود ہے، جیسے پینٹنگز اور گرافٹیز۔ قلعہ چولستان کے ریگستان میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کا منظر بہت دلکش ہے، خاص طور پر سورج غروب ہونے کا وقت قابلِ دید ہوتا ہے۔ قلعہ دراوڑ بہاولپور کے تاریخی مقامات میں شامل ہے اور یہ سیاحوں کے لئے ایک اہم جگہ ہے۔ یہاں ہر سال مختلف ثقافتی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں، جو اس کے تاریخی پس منظر کو اجاگر کرتی ہیں۔ قلعے کے ارد گرد مختلف تاریخی نوادرات بھی ملتے ہیں، جو اس علاقے کی ثقافتی ورثے کی عکاسی کرتے ہیں۔

قلعہ دراوڑ بہاولپور شہر سے تقریباً 48 کلومیٹر دور واقع ہے، اور وہاں پہنچنے کے لئے سڑک کے ذریعے آسان رسائی حاصل ہے۔ سردیوں کے موسم میں یہاں کا دورہ کرنا زیادہ بہتر رہتا ہے جب درجہ حرارت معتدل ہوتا ہے۔ بہاولپور کا قلعہ دراوڑ اپنی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کی بنا پر نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے ایک دلچسپ مقام ہے۔ یہ قلعہ بہاولپور کی تاریخ، ثقافت اور فن تعمیر کی عکاسی کرتا ہے، اور یہاں کی سیر کرنا ایک یادگار تجربہ ثابت ہوتا ہے۔

خود آزمائی

1۔ پنجاب کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ ٹیکسلا ایک اہم تاریخی و ثقافتی مرکز رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

3۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق وادیِ سندھ کی تہذیب کا ایک مرکز ہڑپہ تھا۔ بحث کیجیے۔

4۔ مُغل دور کی فنِ تعمیر کے نادر مناجات نمونہ جات بادشاہی مسجد، شالامار باغ اور ہرن مینار کی صورت میں پنجاب کا اہم اثاثہ ہیں- اس بارے میں اپنے خیالات قلم بند کیجیے۔

5۔ کھیوڑہ کان کہاں واقع ہے اور اس کی وجہ شہرت کیا ہے؟

6۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے ہرن مینار کی تعمیر کس مقصد کے لیے کروائی؟